نومبر ۲۰۲۴ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

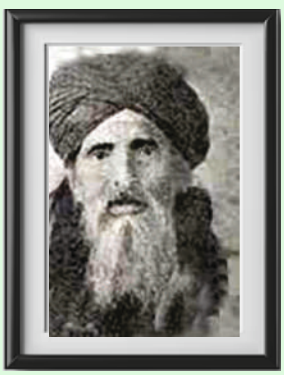

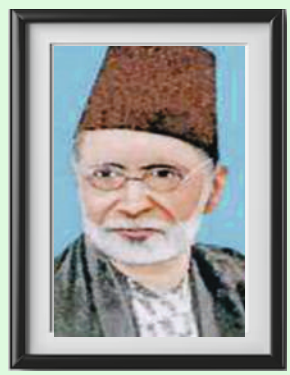

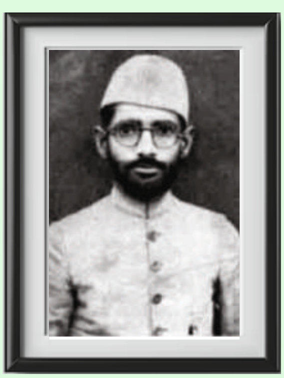

غزل

اصغرؔ گونڈوی

ازل میں کچھ جھلک پائی تھی اس آشوب عالم کی
ابھی تک ذرّہ ذرّہ پر ہے حالت رقص پیہم کی

نظام دہر کیا ، بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں
گدازِ عشق گویا روح ہے ارکانِ عالم کی

نہیں معلوم کتنے جلوہ ہائے حسن پنہاں ہوں
کوئی پہنچا نہیں گہرائیوں میں اشک پیہم کی

خودی ہے جو لئے جاتی ہے سب کو بے خبر کر کے
اسی چھوٹے سے قطرے پر نظر ہے سارے عالم کی

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

غزل کیا ، اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغرؔ گونڈوی کا اصل نام اصغر حسین اور تخلص اصغرؔ ہے ان کے آباواجداد گورکھپور کے رہنے والے تھے، لیکن ان کے والد چونکہ گونڈہ میں قانون گو تھے، اس لئے آخر تک اصغرؔ نے بھی یہیں سکونت رکھی اور اصغرؔ گونڈوی مشہور ہوئے۔ اصغرؔ گونڈوی کی تاریخ ولادت یکم مارچ ۱۸۸۴ء اور جائے پیدائش گونڈہ ہے۔ ان کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی، انہوں نے کسی مدرسہ یا کالج میں مستقل طور پر نہیں پڑھا، البتہ فطری صلاحیت اور ذہانت سے اور ذاتی مطالعہ کی بدولت عربی، فارسی اور اردو میں بے پناہ صلاحیت پیدا کی اور انگریزی بھی اپنے شوق سے پڑھا۔ وہ شاعری میں وجدؔ بلگرامی اور تسلیم لکھنوی سے شرف تلمذ اور تصوف میں حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے شرف بیعت رکھتے تھے۔ اصغرؔ گونڈوی نے ۱۹۲۶ء میں اردو مرکز لاہور میں ملازمت کی، پھر ہندوستانی پریس الٰہ آباد میں اور بعد ازیں ہندوستانی اکاڈمی کے سہ ماہی رسالہ ''ہندوستانی'' کی ادارت پر مامور رہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''نشاط روح'' ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا مجموعہ ''سرودِ زندگی'' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اصغرؔ اُن گنے چنے شعرا میں ہیں جنہوں نے عین وقت پر اردو غزل میں بایں معنی ایک انقلاب لایا کہ اس '' آئینہ جذبات'' پر جو رفتہ رفتہ دھندلا پڑ گیا تھا اور جلا کر دی، جس سے شاعرانِ غزل کے لئے ایک نئی شاہراہ پیدا ہوگئی۔ تصوف سے اصغرؔ کو دلی تعلق تھا، چنانچہ ان کے کلام میں بھی تصوف کے مضامین سے شغف نمایاں ہے۔ مزید برآں نازک خیالی، معنی آفرینی اور زبان کی صفائی کے اعتبار سے بھی ان کی غزلیں نہایت ممتاز ہیں۔ اصغرؔ گونڈوی کی وفات ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو الٰہ آباد میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۱۱

نومبر ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

Web : www.biharurduacademy.in

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

فہرست

اداریہ	حرف آغاز	ابرار احمد خان		۳
ذکرِ اقبالؔ	علامہ اقبالؔ اور صوبہ بہار کے علما و مشاہیر	سید محمد نیر رضوی		۴
	محبِّ وطن علامہ اقبالؔ	اکبر رضا جمشید		۱۲
مقالات	عبدالغفور نساخؔ کی ادبی خدمات	ڈاکٹر سید صابر حسن		۱۴
	جدید افسانے پر ایک نظر	ڈاکٹر نریش		۲۳
	اردو میں ناولٹ نگاری	ڈاکٹر داؤد احمد		۲۴
	مولانا اور مولانا کی چائے	نذیر احمد یوسفی		۲۸
	قمر اعظم ہاشمی: اردو تحریک کا نمایاں نام	ڈاکٹر احسان عالم		۳۰
	پروفیسر وہاب اشرفی کی تنقید نگاری	ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی		۳۵
	ماسٹر رام چندر: حیات و خدمات	ڈاکٹر محمد ثاقب انور		۳۸
	اسماعیل میرٹھی: زندگی اور فن	شاہنواز عالم		۴۴
	آسماں سے آگے: ایک مطالعہ	جوہی عشرت		۴۷
افسانے	چوتھی بیٹی	فرزانہ اسد		۵۰
	خاموش صدا	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی		۵۲
منظومات	ایک مسکراہٹ	فردوسؔ گیاوی		۵۵
	مشروط واپسی / سونامی	سلیم انصاری / میم عین لاڈلہ		۵۶
	غزلیں	پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ		۵۷
	غزلیں	منیر سیفیؔ / نفیسؔ انصاری خیرآبادی		۵۸
	غزلیں	مناظر حسن شاہینؔ		۵۹
	غزلیں	نذرؔ فاطمی		۶۰
	غزلیں	انیسؔ نظمی		۶۱
	غزلیں	شوکت صباؔ کیفی		۶۲
کتابوں کی دنیا	صحرے کی پیاس	ڈاکٹر شمیم صادقہ	مبصر: ڈاکٹر آصف سلیم	۶۳
	امتیاز غدر: شخصیت اور فن	محمد انور	مبصر: ڈاکٹر نظر امام	۶۴
	تذکرۂ جمیل	عطاؔ اللہ پالوی	مبصر: کاظم رضا	۶۶
	دھوپ چھاؤں کا رقص	شبانہ عشرتؔ	مبصرہ: مشہودہ خاتون	۶۸
سلام و پیام	ڈاکٹر ضیاء الدین ضیاؔ، عامر تنویر، ڈاکٹر صابر علی سیوانی			۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ — ۸۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرفِ آغاز

بحمدہٖ تعالیٰ ——— ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ نذرِ خدمت ہو رہا ہے۔ ''ذکرِ اقبالؔ'' سے مشمولاتی آغاز یافتہ اس شمارے میں جہاں علامہ اقبالؔ کے خطوط اور دیگر مستند اقتباسات وحوالہ جات کے ساتھ صنادید بہار سے اُن کے علمی وعقیدت مندانہ مراسم وروابط اور پھر اُن اکابرینِ بہار کی حیات وخدمات کا اجمالی تذکرہ ہوا ہے اور تاریخی وسماجی منظر وپس منظر کے ساتھ اقبالؔ کی وطنی نظموں کے بیانیہ مواد سے استفادہ کرتے ہوئے ''محبِّ وطن اقبالؔ'' کا موضوع مبرہن کیا گیا ہے، وہیں ''مقالات'' کے ضمن میں بھی ''بہار وبیرونِ بہار کی متعدد شخصیتیں متنوع جہات سے یاد کی گئی ہیں۔

مذکورہ مقالاتی صفحات میں کہیں ''عبدالغفور نساخؔ کی ادبی خدمات'' کے زیرِعنوان مدلل انداز اور تحقیقی آداب کے ساتھ ان کی سوانح اور تصانیف کا نام بنام تعارفی ذکر ہوا ہے اور کہیں مختصر تمہید کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کی چائے کی فنجانی کا دلچسپ اور معلوماتی رُخ سامنے لایا گیا ہے تو کہیں زندگی وشخصیت کے احوال اور متعلقہ تاریخی معلومات کے ساتھ قمراعظم ہاشمی کی اردو سے محبت اور اردو تحریک سے ان کی نمایاں وابستگی دکھائی گئی ہے۔ مزید برآں کہیں سنجیدہ تجزیاتی اور انتاجی طریق کار کے ساتھ ''پروفیسر وہاب اشرفی کی تنقید نگاری'' پر نظر ڈالی گئی ہے، کہیں ماسٹر رام چندر کے احوالِ حیات، ان کی علمی وصحافتی خدمات، موضوعاتِ تحریر اور ان کے تصنیفی کارنامے اور ادبی وشعری نظریے پر باتیں ہوئی ہیں اور کہیں ''اسماعیل میرٹھی: زندگی اور فن'' کے عنوان پر لکھتے ہوئے ان کی اُس غزل کا تجزیہ بھی ہوا ہے جو بچوں کے لئے خاص تدریسی نوعیت رکھتی ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ ان مقالاتی اوراق میں کارآمد فکری وفنی اشارے کے ساتھ کہیں ''جدید افسانے پر نظر'' ڈالتے ہوئے انسانی زندگی اور انسانی ذہن کی کہانی کے لطیف فرق کی نشاندہی کی گئی ہے، کہیں ناولٹ کے فن اور تکنیک پر گفتگو کے ساتھ اردو کے اہم ناولٹ زیرِ تذکرہ آئے ہیں اور کہیں احمد صغیر کے ناول ''آسماں سے آگے'' کے فکری وفنی اور انفرادی پہلو اُجاگر کئے گئے ہیں۔

زیرِنظر شمارے کے ''افسانے'' کی ''چوتھی بیٹی'' اگر نفسیاتی لحاظ سے احساسِ کمتری میں ڈوبا ہوا وہ عجیب وغریب کردار دکھاتی ہے جسے جھوٹی شان کی خاطر اپنے خون کا بھی پاس نہیں تو اس کی ''خاموش صدا'' غم کی گھڑی اور غم کے ماحول میں گزری تہذیب کی یادیں سناتی اور اس کا منظر نامہ ہی نہیں دکھاتی ہے بلکہ آج کی میکانیکی زندگی کے وہ نتائج بھی ایک سفاک حقیقت کی صورت میں سامنے لا دیتی ہے جو بوڑھے باپ کے کرب وتاسف اور جوان بیٹے کے جوابی شکوے اور اس کے شخصی وعصری تجربے سے عبارت ہے۔

ہمیں پوری توقع ہے کہ نہ صرف مقالات اور افسانے جالبِ توجہ ہوں گے، بلکہ اس شمارے کی منظوماتی سوغات بھی پسندِ خاطر ہوگی۔ مبصرین کی تحریریں بھی شکایت کا موقع نہیں دیں گی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی انہیں ضرور اچھا لگے گا۔ زیادہ خدا حافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

ذکرِ اقبالؔ

سید محمد نیر رضوی
Flat No.C-3- Rahman Apartment, New paras Toli, Doranda, Ranchi - 834002 (Mob. 8987582814)

علامہ اقبالؔ اور صوبہ بہار کے علما و مشاہیر

صوبہ بہار ہمیشہ سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ہر زمانہ میں اصحابِ فکر و دانش پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس سرزمین نے ایسی ایسی ہستیوں کو جنم دیا جن پر تاریخ کو فخر ہے۔ یہاں علمائے کرام، مشائخ عظام، دانشوران، مدبران، عظیم المرتبت شعرا، صاحب کشف و کرامات صوفیا اور ایسے ہی دیگر مشاہیر وقت کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن کی خدمات کا اعتراف پوری دنیا کیا کرتی ہے اور یقیناً صوبہ بہار کے ایسے ذی صلاحیت علما، شعرا، مشائخ اور دیگر مشاہیر سے ملک اور بیرون ملک کے بہت سارے معروف و مشہور ادبا و شعرا نے رہنمائی حاصل کرنے میں فخر محسوس کیا ہے، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شوقؔ نیموی سے، خواجہ حسن نظامی نے امیر شریعت اول اور سجادہ نشیں، خانقاہ مجیبیہ، حضرت فیاض المسلمین، مولانا شاہ بدرالدین قادری پھلواروی سے اور علامہ اقبالؔ نے حضرت سید سلیمان ندوی سے جس طرح رہنمائی حاصل کی ہے، اسے مورخین نے کتب تاریخ میں نہایت ہی سنہرے حروف میں رقم کر دیا ہے۔

شاعر مشرق اور مفکر اسلام علامہ اقبالؔ نے صوبہ بہار کے ذی صلاحیت علما، شعرا اور دیگر مشاہیر مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ سید سلیمان پھلواروی اور شادؔ عظیم آبادی کے علاوہ دیگر قابل قدر مشاہیر سے نہ صرف قدم قدم پر بہتر رہنمائی حاصل کی، بلکہ ہمیں تو، علامہ اقبالؔ کے مکاتیب کے مختلف مجموعوں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے صوبہ بہار کے مشاہیر سے اپنے روابط کو اس قدر مستحکم کر لیا تھا کہ اُن کا رشتہ، رشتۂ عقیدت و محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؔ اکثر و بیشتر اپنی تخلیقات میں جا بجا یہاں کے علما، شعرا اور دیگر مشاہیر سے اپنے دل کی بات شیئر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مشاہیر بہار کے نام علامہ اقبالؔ کے مکاتیب میں کئی ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں وہ اپنے اقتباسات میں اس قدر جذباتی دکھائی دیتے ہیں جیسے وہ خط نہیں لکھ رہے ہوں، کلام نہیں کر رہے ہوں، بلکہ صرف اور صرف اپنے دل کی دھڑکن سنا رہے ہوں، چنانچہ صوبہ بہار کے مشہور و معروف شاعر شادؔ عظیم آبادی کے نام تحریر کردہ ایک مکتوب (۲۵ر اگست ۱۹۲۴ء) سے یہ اقتباس دیکھئے جس میں علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں:

> ''جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے، لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظام تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے۔ کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔''

(کلیات مکاتیب اقبالؔ: جلد اول: سید مظفر حسین برنی: ص ۹۴۱)

اسی طرح علامہ اقبالؔ اپنے ایک محبت نامہ میں سید سلیمان ندوی سے اس طرح مخاطب ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ آپ کی تنقید سے مستفید ہوں گا۔'' (کلیات مکاتیب اقبالؔ: جلد ا، ص ۷۰۵)

سید سلیمان ندوی کے بارے میں علامہ اقبالؔ کے خیالات بڑے اعلیٰ و ارفع ہیں، اپنے خط کے ایک اقتباس میں اس طرح فرماتے ہیں:

> ''آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں امیر العلما ہیں۔ مصنف ہی نہیں رئیس المصنّفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔''

علامہ اقبالؔ ایک اور موقع پر علامہ سید سلیمان ندوی کے لئے اس طرح

رطب اللسان ہیں:

’’آپ کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے از بس ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے تا کہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مستفیض ہوتے رہیں۔‘‘

علامہ اقبالؔ ایک اور مقام پر از راہ عقیدت اس طرح فرماتے ہیں:

’’علوم انسانی کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟‘‘

ان اقتباسات سے اندازہ لگایئے کہ علامہ اقبالؔ کے دل میں سید سلیمان ندوی کی کس قدر عزت تھی ، دوسری طرف سید سلیمان ندوی بھی علامہ اقبالؔ کا بہت احترام کرتے تھے، فرماتے ہیں:

’’اقبالؔ صرف شاعر نہ تھا ، وہ حکیم تھا ، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلامِ الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے۔ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا۔ یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔‘‘

(اقبالؔ اور سید سلیمان ندوی: طاہر تونسوی، ص ۱۹)

اس طرح اہل بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ اگر علامہ اقبالؔ نے یہاں کے مشاہیر علم و ادب سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے تو اہل بہار نے بھی علامہ سے اُسی طرح اپنی حرارت قلبی کا اظہار کیا ہے۔ علم و ادب اور دانشمندی کی بنیاد پر دو طرفہ محبت و عقیدت کی ایک اور نادر مثال دیکھئے۔

بہار کے مشہور ادیب و دانشور اور قابل استناد ناقد حضرت امداد امام اثرؔ کے صاحبزادے، کلکتہ ہائی کورٹ کے نامور قانون داں بیرسٹر، ریاست حیدر آباد کے پہلے وزیر اعظم اور عثمانیہ یونیورسیٹی کا منصوبہ تیار کرنے والی معتبر شخصیت یعنی سر علی امام جب لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے تو دوران سفر ہی اُن کی ملاقات علامہ اقبالؔ سے ہو گئی۔ سر علی امام، علامہ اقبالؔ کی قدر و منزلت اور شاعرانہ عظمت کی وجہ سے نہایت عزت و احترام سے پیش آئے اور علامہ اقبالؔ بھی سر علی امام کے ایک بڑے مداح نظر آئے۔ علامہ اقبالؔ نے سر علی امام کو اُن کی علمی بصیرت و بصارت کے پیش نظر اپنے ایک شعر میں ’’نگہدار حق اُمت خیر البشر‘‘ کہا ہے اور اپنے پہلے ہی فارسی مجموعہ کلام ’’اسرار خودی‘‘ میں باضابطہ ایک قصیدہ اُن کے نام سے بعنوان ’’بحضور سر سید علی امام‘‘ معنون کیا ہے۔ اُس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

ای امـــام ای سیـــد والا نســب
دو دمـــانــت فـخـر اشـراف عـرب
سـلـطـنـت را دیـده افـروز آمـدی
عـقـل کل را حـکـمت آموز آمـدی
ملت را جسم است شاعر چشم اوست
جسم را از چشم بیـنـا آبـروست
چشم از نـور مـحبت رو شـنـم
اشـکـبـار از دردی اعـضـای تـنـم

اور آخری شعر اس طرح ہے کہ ۔

نـذر اشك بـی قـرار از مـن پـذیـر
گـریـه بـی اختیـار از من پذیر

علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) کی مقبولیت ہمہ گیر ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مدبر و مفکر اور فلسفی بھی ہیں۔ فارسی زبان میں علامہ اقبالؔ کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو اس طرح ہیں: ’’اسرار خودی‘‘، ’’رموز بے خودی‘‘، ’’پیام مشرق‘‘، ’’زبور عجم‘‘، ’’جاوید نامہ‘‘، ’’مسافر‘‘، ’’پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق‘‘ اور ’’ارمغان حجاز‘‘ اسی طرح

شاد عظیم آبادی — علامہ سید سلیمان ندوی — مولانا مسعود عالم ندوی — علامہ شاہ سلیمان پھلواری

اُردو زبان میں بھی آپ کا چار مجموعہ کلام ''بانگ درا''، ''بال جبریل''، ''ضرب کلیم'' اور ''ارمغان حجاز'' بہت مشہور ہے۔

علامہ اقبالؔ نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا اُس دور میں دو دبستان شاعری: ''دبستانِ دہلی'' اور ''دبستانِ لکھنؤ'' وجود میں آچکے تھے، مگر ان کے دائرۂ عشق میں ''شاعری'' گل و بلبل اور وجودزن سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی، البتہ یہ علامہ اقبالؔ کا وصف کمال ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اِن اصطلاحات کے معنی ہی بدل دیے۔ دوسری طرف غالبؔ کے بعد علامہ اقبالؔ اُردو کے دوسرے وہ بڑے عظیم المرتبت شاعر ہیں جن کی نثر بالخصوص اُن کے خطوط نے ادب میں اپنا مقام طے کیا۔

علامہ اقبالؔ کا دائرۂ احباب اور حلقۂ تعارف بہت وسیع تھا جس میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر والیانِ ریاست، علمائے کرام، مشائخ عظام، دانشوران ملت اور دیگر مشاہیر سے لے کر اُن کے خادم علی بخش تک سیکڑوں مکتوب الیھم کے نام نامی شامل ہیں۔ سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب ''اتالیق خطوط نویسی'' میں علامہ اقبالؔ کے چند خطوط شائع کئے اور اُس کے بعد سے مکاتیب اقبالؔ کی اشاعت کا سلسلہ جو شروع ہوا تو وہ ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ ابھی تک بہت سارے مجموعہ خطوط منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا ''شادؔ و اقبالؔ''، ''شیخ عطا اللہ کا ''اقبالؔ نامہ''، کے علاوہ ''اقبالؔ'' از عطیہ بیگم ''اقبالؔ کے خطوط جناح کے نام''، ''مکاتیب اقبالؔ''، ''مکتوبات اقبالؔ''، ''انوار اقبالؔ''، ''نوادر اقبالؔ''، ''خطوط اقبالؔ'' اور ''اقبالؔ نامہ'' وغیرہ بہت ہی اہم ہیں۔

شناسان اقبالؔ اور ماہرین اقبالیات، علامہ اقبالؔ کی شاعری اور اُن کے مکاتیب کے مطالعات و مشاہدات سے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ علامہ اقبالؔ کے قلم نے جب کبھی زور دکھایا، تو اُن کی تخلیقات میں

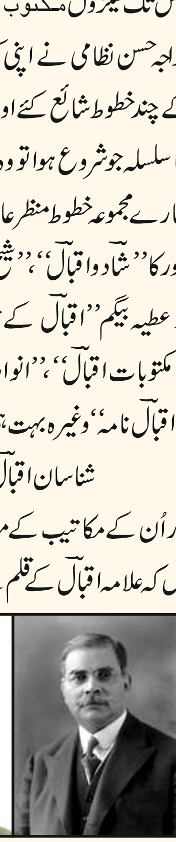

سر علی امام

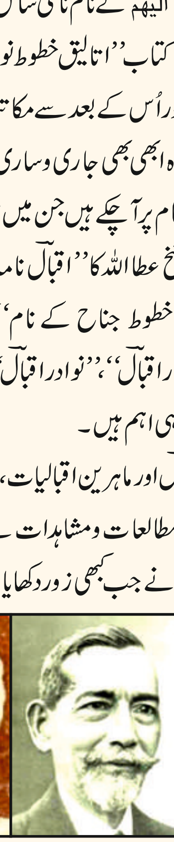

ڈاکٹر عظیم الدین احمد

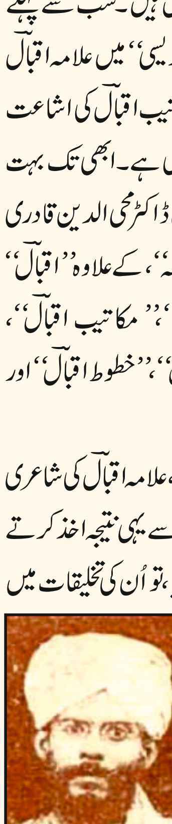

حامدؔ عظیم آبادی

بالعموم علمی، تاریخی، معاشی، اسلامی، متصوفانہ اور فلسفیانہ مسائل زیر بحث آئے ہیں اور نظریاتی تحریکاتی اور تصوراتی پس منظر اور پیش منظر پر تبادلہ خیال ہوا ہے۔ ہمیں، علامہ اقبالؔ کی شاعری بالخصوص اُن کی نثر یعنی مکاتیب اقبالؔ میں جو اوصاف خاصہ دیکھنے کو ملتے ہیں، اُن میں حکیمانہ نکات و معارف، بہترین انداز استدلال، منطقی انداز پیشکش، قابل قدر جامعیت اور گہری معنویت بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مشمولات بالا کے تناظر میں صوبہ بہار کے اُن چند علما اور دیگر مشاہیر کی علمی و ادبی شخصیت اور شاعر مشرق، حکیم اُلامت علامہ اقبالؔ کے ساتھ اُن کے محبت و عقیدت بھرے رشتے، پر مختصر سی بحث پیش خدمت ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) ساکن دسنہ، بہار شریف، ایک جید عالم دین، عظیم دانشور اور معتبر مورخ و محقق تھے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر محی الملة والدین، امیر شریعت ثانی اور سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ، حضرت محی الدین قادری قدس سرہٗ سے کچھ اہم کتابوں کا درس لیا، پھر مدرسہ امدادیہ، دربھنگہ میں داخلہ لیا اور اس کے بعد دارالعلوم، ندوۃ العلما، لکھنؤ میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۰۷ء میں نمایاں کامیابی کے ساتھ فراغت حاصل کر کے ''الندوہ'' کے مدیر مقرر کئے گئے اور پھر وہیں علم کلام اور جدید عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ علامہ شبلی نعمانی کے حقیقی جانشیں اور دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کے بانیوں میں سے تھے۔ اسی دارالمصنّفین میں سید سلیمان ندوی کے نام علامہ اقبالؔ کے چھیاسٹھ خطوط محفوظ ہیں۔

آپ نے ۱۹۱۶ء میں ''معارف'' کا اجرا کیا جو آج تک یہاں سے اسی راہ ہدایت پر شائع ہو رہا ہے۔ سید سلیمان ندوی کئی اہم بین الاقوامی وفود میں شامل رہے۔ آپ کی قابل قدر اور بہت ہی اہم تصانیف ''ارض قرآن''، ''سیرت النبی'' (چھ جلد) ''سیرت عائشہ''، ''عمر خیام''، ''نقوش سلیمانی'' اور ''حیات شبلی'' وغیرہ ہر عہد میں نئی نسل کی بہتر رہنمائی کے لئے بیش قیمتی رہنما خطوط کا مرتبہ رکھتی ہیں اور گہوارۂ علم و ادب اور شعبہ تہذیب و تمدن کے قیمتی خزانوں میں نہایت بیش قیمت اضافہ ہیں۔ علامہ اقبالؔ کو سید سلیمان ندوی سے اُن کی علمی، ادبی اور

مذہبی خدمات کے اعتراف کے پیش نظر بڑی محبت وعقیدت تھی۔ وہ اکثر و بیشتر دینی، فقہی، ملّی اور ادبی مسائل پر سید صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ قابل قدر مصنف طاہؔر تونسوی نے اپنی تصنیف ''اقبالؔ اور سید سلیمان ندوی'' میں بعنوان ''مکاتیب اقبالؔ بنام سید سلیمان ندوی'' کے تحت ۷۰ خطوط جمع کر دئے ہیں۔ ذیل میں انہی خطوط سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے جن سے علامہ اقبالؔ اور علامہ سید سلیمان ندوی ؒ کے درمیان گہرے روابط کا اندازہ ہوگا:

''آپ کا نوازش نامہ قوت روح اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے، میں ایک مدت کے مطالعہ اور غور وفکر کے بعد اُنہیں نتائج پر پہنچا ہوں جو آپ کے والا نامہ میں درج ہیں، جو کام آپ کر رہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔''

۱۳رنومبر ۱۹۱۷ء (اقبالؔ اور سید سلیمان ندوی: طاہر تونسوی، ص ۲۸)

''رموز بیخودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا، اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہوگیا، امید کہ توجہ فرمائی جائے گی، تاکہ میں دوسرے ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہوسکوں۔''

۸ردسمبر ۱۹۱۸ء (اقبالؔ اور سید سلیمان ندوی ص ۴۲)

''کئی روز ہو گئے ایک عریضہ خدمت عالی میں لکھا تھا، جواب سے ہنوز محروم ہوں۔ 'خیمہ برزداز حقیقت در مجاز' کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ 'از' میں تجاوز کا مفہوم نہیں ہے، کیونکہ 'خیمہ برزدن' کے معنی قیام کرنے کے ہیں، میں تلاش میں تھا کہ کوئی سند مل جائے، جیسا کہ میں نے گزشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا، آج کلیات سعدؔی میں وہ سند مل گئی۔'' ۲۰رنومبر ۱۹۱۸ء

(اقبال اور سید سلیمان ندوی، ص ۴۴)

علامہ سید شاہ سلیمان پھلواروی

علامہ سید شاہ سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹ء-۱۹۳۵ء) ساکن پھلواری شریف، پٹنہ، ایک صوفی بزرگ اور متبحر عالم دین تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ، سہارن پور اور دہلی میں رہ کر تقریباً ساٹھ سے زیادہ اساتذۂ کرام سے حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا، جن میں مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، احمد علی محدث، سید نذیر حسین محدث، مولانا مظہر نانوتوی، مفتی عباس لکھنوی، حکیم عبدالعزیز دریا آبادی اور مفتی جمیل بلگرامی وغیرہ کافی اہم ہیں۔ صاحب سجادہ، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ حضرت شاہ علی حبیب نصؔر قدس سرہ آپ کے خسر بھی تھے اور آپ کے پیرومرشد بھی۔ آپ کا شمار وسیع النظر علمائے ربانی میں ہوتا ہے۔ آپ اپنی علمی اور ادبی صلاحیت اور وسعت معلومات کی بنا پر اسلامی دنیا بالخصوص حجاز، عراق، مصر، یمن اور فلسطین میں بھی نہایت مقبول ومعروف تھے۔ آپ کو ایام طالب علمی سے ہی تحریر وتقریر کا ذوق تھا اور آپ کے انداز خطابت کا شہرہ تھا، یہاں تک کہ سر سید احمد خاں بھی آپ کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ایک تحقیق کے مطابق آپ ساٹھ سے زائد چھوٹی بڑی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کے خالق ہیں۔ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ اور مجلس ندوۃ العلماء کے بانیوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ملک وملت اور مذہب دین کے حق میں خواجہ حسن نظامی نے سید سلیمان پھلواروی کا تعارف، علامہ اقبالؔ سے کرایا تھا، پھر تو یوں ہوا کہ علامہ اقبالؔ دینی امور پر سید سلیمان پھلواروی کی مہارت کے باعث اُن کے مداحوں میں شامل ہوگئے، چنانچہ علامہ اقبالؔ کے مجموعہ کلام ''اسرار خودی'' کی طباعت کے بعد جب ''مسئلہ وحدت الوجود'' پر ہنگامہ برپا ہوا اور نظریہ وحدت الوجود سے شدید اختلاف پیدا ہوا، تو علامہ کو بھی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے حوالے سے اشکال پیدا ہوا اور انہوں نے سید

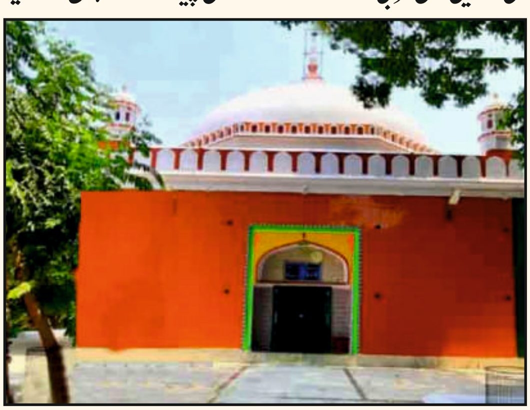

درگاہ شاہ ارزاں، پٹنہ

شاہ سلیمان پھلواروی سے رجوع کیا اور اسے دور فرمانے کے لئے ۲۴ر فروری ۱۹۱۴ء کو انہیں ایک خط لکھا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخؒ کی تعلیمات قرآن کے مطابق ہیں اور نہ کسی تاویل وتشریح سے اس کے مطابق ہوسکتی ہیں، لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخؒ کا مفہوم غلط سمجھا ہو۔ کئی سالوں سے میرا یہی خیال رہا ہے کہ میں غلطی پر ہوں، گو اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک قطعی نتیجے پر پہنچ گیا ہوں، لیکن اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لئے کوئی ضد نہیں ہے۔ اس واسطے بذریعہ عریضہ ہٰذا آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ ازراہ عنایت ومکرمت چند اشارات تسطیر فرمادیں۔ میں ان اشارات کی روشنی میں 'فصوص' اور 'فتوحات' کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم ورائے میں مناسب ترمیم کرلوں گا۔ اگر آپ ایسا ارشاد فرمادیں تو میں مدت العمر آپ کا شکرگزار رہوں گا۔'' (کلیات مکاتیب اقبالؔ: ج۱، ص۴۷۴)

علامہ اقبالؔ کے اس خط سے علامہ کی نگاہ میں سید شاہ سلیمان پھلواروی کی غیر معمولی علمی وادبی اور باوقار مذہبی شخصیت اور اُن کی قدرومنزلت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، پھر ایک وقت ایسا بھی آیا، جب خواجہ حسن نظامی قدس سرہٗ اور علامہ اقبالؔ کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوگئے، اس نازک موقع پر بھی علامہ سید شاہ سلیمان پھلواروی نے دونوں کے درمیان

(کرسی پر دائیں سے) مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی، حضرت قبلہ مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی پھلواروی
(کھڑے ہوئے دائیں سے) شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال، جناب ملا واحدی دہلوی

اختلافات کو رفع کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، چنانچہ علامہ اقبالؔ کے اُس خط کا ایک اقتباس دیکھئے جو لاہور سے ۹ر مارچ ۱۹۱۶ء کو لکھا گیا تھا:

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ مولانا اسلام علیکم

جناب کا والا نامہ مل گیا ہے جس کو پڑھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ آپ کو مثنوی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمال روحانی کے ساتھ علم وفضل سے آراستہ کیا ہے۔ میں نے خواجہ حسن نظامی کو بھی لکھا تھا کہ مثنوی سے اختلاف نہ کیجئے۔ دیباچہ میں جو بحث ہے اس پر لکھئے، مگر افسوس ہے کہ انہوں نے آج تک ایک حرف بھی اس کے متعلق نہیں لکھا۔ آپ کی تحریر سے مجھے یقیناً فائدہ ہوگا، میری استدعا ہے کہ مثنوی کے متعلق بھی جو خیال آپ نے خط میں تحریر فرمایا ہے، اس مضمون میں ظاہر فرمایئے کہ جو غلط فہمی خواجہ حسن نظامی کے مضامین سے پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہوجائے۔'' (کلیات مکاتیب اقبالؔ: ج۱، ص۴۷۸)

شادؔ عظیم آبادی

شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶ء- ۱۹۲۷ء) صرف صوبہ بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں ایک عظیم شاعر کی حیثیت اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ آپ کا پورا نام سید علی محمد ہے اور شادؔ تخلص۔ مشہور انقلابی شاعر بسملؔ عظیم آبادی، جنہوں نے ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' جیسی انقلابی نظم لکھی، آپ کے شاگرد تھے۔

شادؔ نے اُردو فارسی اور عربی زبان وادب، مذہبی علوم اور فن شعرگوئی میں ایسی مہارت حاصل کی کہ آج اُن کا شمار دور جدید کے مشہور ومعروف ادیب و دانشور اور کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی حیات میں ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہہ دیا۔ شادؔ کا دیوان ''نغمۂ الہام'' ۱۲۰۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی شعری تصانیف میں ''حیات فریادؔ''، ''رباعیات شادؔ''، ''سروش مستی''، ''میخانۂ الہام'' اور نالہ شادؔ'' قابل ذکر ہیں۔ کلیم الدین

احمد جیسا بڑا نقاد بھی آپ کے علمی و ادبی مقام اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ سر عبدالقادر کی ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ ''مخزن'' کے ابتدائی دور کے قلم کاروں میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ شادؔ عظیم آبادی اپنے ہمعصر عظیم المرتبت شاعر علامہ اقبالؔ کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اُن کی شاعری کے مداحوں میں سے تھے اور علامہ اقبالؔ بھی شادؔ عظیم آبادی کی معیاری شاعری کی قدر و قیمت سے بہت اچھی طرح آشنا تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان بڑے ہی گہرے مراسم تھے۔ شادؔ عظیم آبادی کو لکھے ایک خط کا اقتباس دیکھئے یہ خط ۲۵؍اگست ۱۹۲۴ء کو لاہور سے لکھا گیا تھا۔ اس خط سے علامہ اقبالؔ کی والہانہ شفقت یقیناً نکھر کر سامنے آرہی ہے:

مخدومی تسلیم!

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے۔ اس غائبانہ عقیدت کی وجہ سے جو آپ سے ہے، یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمہ وجوہ خیر و عافیت سے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے آپ کی لٹریری مصروفیتیں کم نہیں ہوئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تصانیف تمام ملک کے لئے مفید ہوں گی اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی تکمیل کے لئے دیر تک سلامت رکھے۔ جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے، لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظام تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے۔ کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔''

(خطوطِ اقبال: رفیع الدین ہاشمی، ص۱۷۰)

سر علی امام

سر علی امام (۱۸۶۹ء۔۱۹۳۲ء) ساکن کرائے پر سرائے، نالندہ، کو حکومت برطانیہ کی جانب سے ''سر'' کا خطاب ملا تھا۔ پروفیسر اقبال حسین نے اپنی آپ بیتی ''داستان میری'' (مطبوعہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۹ء) میں علامہ اقبالؔ اور سر علی امام کے خوشگوار تعلقات کا بڑا ہی خوشگوار انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ علامہ اقبالؔ، اُن کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ ''اسرارِ خودی'' کا طبع اول سر علی امام کے نام معنون کر دیا تھا، مگر جب اس اعتراض نے طول پکڑا کہ علامہ اقبالؔ نے ایک بااثر اور ذی حیثیت شخص کے نام اپنے ایک قابل قدر شعری مجموعہ کو منسوب کر دیا ہے، تو علامہ اقبالؔ نے بعد کے آنے والے تمام ایڈیشن سے سر علی امام کا نام حذف کر دیا۔ ان دونوں کے درمیان نہایت ہی خوشگوار تعلقات تھے۔ اس خوشگوار تعلقات کا اندازہ علامہ اقبالؔ کے اس خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس (۱۲؍نومبر ۱۹۳۰ء) میں شرکت کی غرض سے وہاں جاتے ہوئے اپنے ہم سفر سر علی امام کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''سر علی امام ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے، میں بھی اُن کے ہمراہ تھا، میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے دیکھو بھئی اقبالؔ اس وقت ہمارا جہاز مدینہ کے ساحل کے سامنے سے گزر رہا ہے، یہ فقرہ ابھی پورے طور پر منھ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت حاصل کی۔ ان کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار بولے: 'بلّغ سلامی روضۃ فیھا النبی المحترم' اُن کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔''

(رموزِ تحقیق، ڈاکٹر سید شاہد اقبال، ص۲۱)

علامہ اقبالؔ نے اس بحری سفر کے تاثرات کو اپنے خطوط میں قلم بند کیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی اپنے متعدد خطوط اور چند مضامین میں سر علی امام کا ذکر کیا ہے اور اُن کی شخصیت سے متاثر ہو کر اُن کی تعریف کی ہے۔ سر علی امام کا انتقال ۳۱؍اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ہوا اور تدفین اُن کی کوٹھی میں ہوئی۔ سر علی امام کے انتقال کے بعد اُن کی بیوہ بیگم لیڈی انیس امام نے اپنے شوہر کے قبر پر کتبہ کے لئے علامہ اقبالؔ سے چند اشعار کی فرمائش کی، علامہ اقبالؔ نے بھی فوراً انگریزی میں خط کا جواب دیا اور فارسی کے اشعار تحریر کر کے روانہ کیا۔ (رموزِ تحقیق: ڈاکٹر سید شاہد اقبال، ص۲۲)

ڈاکٹر عظیم الدین احمد

ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۹ء) ساکن صادقپور، عظیم آباد، پٹنہ، دنیائے علم وادب بالخصوص تنقید کی دنیا کے بے تاج بادشاہ یعنی عظیم ناقد اور دانشور: پروفیسر کلیم الدین احمد کے والد محترم تھے۔ آپ نے عربی، فارسی اور طب کی تعلیم اپنے نانا جید عالم دین اور صوفی حکیم عبدالحمید پریشاںؔ سے حاصل کی جو ایک صاحب حال صوفی تھے اور جید عالم دین بھی۔ آپ کا سلسلۂ نسب مشہور صوفی کبیر سے جاملتا ہے جن کی خانقاہ کبیریہ، آج بھی شہر سہسرام کی مشہور خانقاہ ہے۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اورینٹل کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے صدر شعبہ مقرر ہوئے جہاں علامہ اقبالؔ سے اُن کی ملاقات ہوئی اور علامہ کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور خلیفہ شجاع الدین وغیرہ اہم شخصیتیں بھی اُن کے رفقا میں شامل ہوئیں۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد، وہاں کے علمی وادبی حلقہ میں ایک نمایاں شخصیت کے طور پر تسلیم کئے جاتے تھے۔ لاہور سے پٹنہ واپس آ کر خدا بخش لائبریری میں کیٹلاگر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد پٹنہ یونیورسیٹی میں عربی اور فارسی کے استاذ مقرر ہوئے اور پھر خان بہادر محمد یٰسین صاحب، صدر شعبہ کی سبکدوشی کے بعد یہاں صدر شعبہ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ وہ ایک نہایت ہی سنجیدہ صاحب دیوان شاعر تھے اور نبض شناس حکیم بھی تھے۔ مجموعہ کلام کا نام ''گل نغمہ'' ہے۔ مشہور ومعروف شاعر پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ عظیم آبادی، ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اُن کو علامہ اقبالؔ سے والہانہ عقیدت تھی، جب وہ علامہ اقبالؔ کی نظمیں بالخصوص ''مسجد قرطبہ'' اور ''تصویر درد'' وغیرہ کا درس دیتے تو بہت جذباتی ہو جاتے اور اُن کے آنسو اُن کے الفاظ پر سبقت لے جاتے۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور علامہ اقبالؔ کے باہمی دوستانہ تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے صاحبزادے اور عظیم ناقد و دانشور پروفیسر کلیم الدین احمد کا بیان دیکھئے:

''عظیم اور اقبالؔ ہم خیال اور دوست تھے، دونوں ایک مدت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے، دونوں کے بہتیرے افکار ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جب اقبالؔ نے 'تصویر درد' لکھی تھی تو عظیم الدین نے یہ کہا تھا کہ 'تصویر درد' تو کھینچی ہے ذرا تاثیر درد بھی دکھایئے تو اقبالؔ نے کہا تھا کہ میں نے تو درد کی تصویر کھینچ دی ہے، تم اس کی تاثیر دکھاؤ، چنانچہ عظیم الدین نے 'تاثیر درد' کے عنوان سے ایک نظم ہی لکھ دی جس کے اخیر میں یہ لکھا۔

مجھے اقبال فرماتے ہیں اب خاموش ہو ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منھ میں اور تاب سخن بھی ہے
نمی گویم کہ من حق اخوت را ادا کردم
ہمی دانم کسی بر من جفا کرد و وفا کردم''

(ڈاکٹر عظیم الدین احمد: حیات اور شاعری، ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن، ص ۴۲)

اسی طرح ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے بارے میں، اُن کے شاگرد عزیز اور عظیم محقق ومورخ ڈاکٹر اختر اورینوی فرماتے ہیں:

''علامہ عظیم، علامہ اقبالؔ کی طرح اسرار حیات منظر عام پر لاتے ہیں اُن کے ہاں بھی حکمت کی باتیں زبان شعر پر جاری ہیں، مگر باانداز شاعرانہ۔'' (ڈاکٹر عظیم الدین احمد: حیات اور شاعری: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن، ص ۱۰۰)

مولانا مسعود عالم ندوی

مولانا مسعود عالم ندوی (۱۹۱۰ء–۱۹۵۴ء) گاؤں ''اوگاؤں'' بہار شریف، نالندہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد ۱۹۲۸ء میں ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ مولانا مسعود عالم ندوی عربی زبان کے عظیم انشاء پرداز، معروف ادیب اور جید عالم دین تھے۔ سعودی عرب کی حکومت نے اُن کے مقام ومرتبہ کو پہچانتے ہوئے اپنے ملک میں ایک سڑک کا نام ''شارع مسعود عالم ندوی'' رکھا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک کے قابل قدر عربی رسائل و جرائد میں اُن کے مضامین مسلسل شائع ہوتے تھے۔ وہ قاہرہ کے ہفتہ وار رسالہ ''الفتح'' کے مستقل مضمون نگار بھی تھے۔ ایک عرصہ تک ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں ''الضیاء'' کے مدیر اور عربی استاد کی حیثیت سے وہاں قیام فرمایا۔ سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی نعمانی کے علمی لحاظ سے جانشیں تھے تو مولانا مسعود عالم ندوی قدس سرہٗ کو علامہ سید سلیمان ندوی کے حقیقی جانشینی کا شرف حاصل ہوا

تھا، پھر خدا بخش لائبریری میں کیٹلاگر مقرر ہوئے۔ بعدۂ جب جماعت اسلامی کی فکر سے منسلک ہوئے تو تا دم آخر اسی جماعت سے وابستہ رہے۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ آپ کی عمر نے وفا نہیں کی اور محض ۴۴ برس کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ شیخ عطا اللہ نے اپنی تالیف ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) میں علامہ اقبال کے سات خطوط بنام سید مسعود عالم ندوی شامل کیا ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید مسعود عالم ندوی، عمر میں علامہ اقبال سے بہت چھوٹے تھے، مگر علامہ بطور ذی صلاحیت عربی ادیب، اُن کی صلاحیتوں اور علمی وادبی خدمات کا عتراف کرتے ہوئے بڑی عزت دیتے تھے۔ چنانچہ ذیل میں ایک خط کا ایک اقتباس دیکھئے جو لاہور سے ۱۲؍فروری ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا تھا:

ڈیئر مولانا مسعود عالم، السلام علیکم

آپ کا خط عین اس وقت پہنچا جب کہ میں ابن قیم کی اعـلام الـمـوقـعـين پڑھ رہا تھا۔ خدائے تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میرے مطلب کے لئے مسالہ آپ نے جمع کر دیا ہے۔ اب اگر ضرورت ہوئی تو اسی سے فائدہ پاؤں گا۔ مولینا سید سلیمان ندوی کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔'' (''اقبال نامہ: شیخ عطاءاللہ: ح ا، ص ۴۰۴)

علامہ اقبال کو جب علامہ سید سلیمان ندوی کی علالت کی اطلاع ملی تو وہ بے چین ہو ہو کر سید مسعود عالم ندوی، جانشین سید سلیمان ندوی کو ہی مسلسل خط لکھ لکھ کر خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ اُن کا ہر خط، علامہ سید سلیمان ندوی سے گہرے تعلقات کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے ہی ایک خط کا ایک اقتباس دیکھئے جو ۲۸؍نومبر ۱۹۳۵ء کو لکھا گیا ہے:

مخلصی، السلام علیکم — کتب مرسلہ آج موصول ہو گئیں۔ بہت بہت شکریہ قبول فرمایئے، مولانا کاشغری کی خدمت میں علیحدہ عریضہ لکھ دیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی علالت کی خبریں بہت متردد کر رہی ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو صحت عاجل مرحمت فرمائے۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفسارِ حالات کیجئے۔ اس وقت علمائے ہند میں وہ نہایت قابل احترام ہستی ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو دیر تک زندہ رکھے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص محمد اقبال۔'' (اقبال نامہ ح ا'' ص ۴۰۱)

درگاہ شاہ ارزاں میں علامہ اقبالؔ کی حاضری

علامہ اقبالؔ نے ۱۹۲۰ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں صوبہ بہار کے ضلع آرہ کا دورہ کیا، جب وہ یہاں آئے تو انہوں نے حضرت دیوان شاہ ارزانی، سلطان گنج، پٹنہ کے مزار مبارک پر بھی حاضری دی۔ حضرت شاہ بہلول بحر دریا (مدفون: بہلول پورہ، مغربی پنجاب) کے دو خلیفہ تھے۔ ایک حضرت مادھولال حسین (پنجاب) اور دوسرے حضرت دیوان شاہ ارزانی (پٹنہ، بہار) اُس وقت درگاہ شاہ ارزاں کے صاحب سجادہ حضرت سید حامد حسین حامدؔ عظیم آبادی قدس سرہٗ (۱۸۸۲ء-۱۹۶۷ء) تھے جو داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے اور علامہ اقبالؔ کو بھی داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا، چنانچہ عقیدت ومحبت کے ان رشتوں کے پیش نظر علامہ اقبالؔ یہاں حاضر ہوئے۔ علامہ اقبالؔ نے خان محمد نیاز الدین خان کو لکھے اپنے ایک خط میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے:

''مخدومی! السلام علیکم

میں ایک طویل سفر کے بعد پرسوں لاہور آیا ہوں۔ ایک مقدمہ کے ضمن میں آرہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا۔ اب تو کچھ ہفتہ تک مزید سفر کی ہمت نہ ہوگی۔'' (مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خان: اقبال اکادمی، پاکستان، ص ۴۷)

(رموز تحقیق مصنف وناشر: ڈاکٹر سید شاہد اقبال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی: ۲۰۱۷ء، خطوطِ اقبال: مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، اقبال صدی پبلی کیشنز نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، اقبالؔ نامہ، شیخ عطا اللہ، حصہ اول یعنی مجموعہ مکاتیب اقبالؔ، ناشر، شیخ محمد اشرف، تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، اقبالؔ اور سید سلیمان ندوی، ترتیب وتالیف طاہر تونسوی، ناشر الطاف حسین، مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور، ۱۹۷۷ء، اقبالؔ اور مشرقی مفکرین، پروفیسر منظر حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۲۲ء، کلیات مکاتیب اقبالؔ، جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی، دہلی، نومبر ۱۹۸۹ء، مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خان، اقبال اکادمی، پاکستان، ناشر پروفیسر محمد منور، کارواں پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم آبادی: حیات اور شاعری، ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن، نکھار پبلی کیشنز مؤ ناتھ بھنجن، یوپی، نومبر ۱۹۸۳ء اور مولانا مسعود عالم ندوی: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، جولائی ۱۹۹۸ء سے خصوصی اخذ واستفادہ کے ساتھ)

اکبر رضا جمشید
Retd. Dist Judge, Afzalpur, Patna - 800006 (Mob.9123112008)

محبّ وطن علامہ اقبالؔ

ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے اس ملک کی فضا بڑی پیاری اور خوشگوار تھی، یہاں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ دونوں کی تہذیب اگر چہ الگ الگ تھی، مگر دونوں نے ایک دوسرے کی تہذیب اپنا کر ایک نئی تہذیب بنائی تھی جو گنگا جمنی تہذیب کہلاتی ہے۔ مسلمان ہندوؤں سے اس طرح گھل مل گئے تھے کہ انہوں نے ان کے بہت سارے رسم ورواج اپنا لئے۔ مسلم عورتوں نے شادی کے موقعوں پر ہلدی، مہندی، تیل، اوبٹن، منڈوا، کنگن وغیرہ کی رسمیں اپنا لیا، لیکن یہ محبت اور بھائی چارگی انگریزوں کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے ہندوستانی گنگا جمنی کو نظر لگا دیا اور حکمرانی کی ہوس میں ایک دوسرے کو اُکسانا اور بگاڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ انگریزوں نے ۱۸۹۳ء میں دونوں کو لڑا دیا اور مذہب اور زبان کے نام پر فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا کر اس میں اپنی روٹی سینکنے لگے اور اپنی حکومت کو مستحکم کر لیا۔

انگریزوں کی ناپاک سازش کے وقتی نتائج اپنی جگہ، لیکن محبت اس ملک کے باشندوں کی خمیر میں تھی اور اُن حالات میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو مسلسل اتحاد کی کوشش میں لگے رہے، ایسے ہی لوگوں میں ایک نام اردو کے مشہور ومعروف شاعر علامہ اقبالؔ کا بھی ہے۔

علامہ اقبالؔ کا دل ہندو مسلم فسادات اور خون خرابہ دیکھ کر دہل گیا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایکتا اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے نظم ''نیا شوالہ'' لکھی اور پنڈتوں اور ملاؤں کو سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں نے مذہب کو صحیح نہیں سمجھا ہے۔ آؤ! ہم بیگانگی کا پردہ اٹھا کر ایک ہو جائیں اور بچھڑے ہوئے لوگوں کو ایک کر دیں۔ آؤ! ہم مل جل کر محبت کا ایک نیا عبادت خانہ بنائیں اور ہر صبح اٹھ کر محبت کے میٹھے میٹھے بھجن اور ترانے گائیں کہ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اقبالؔ وطن کی محبت سے سرشار تھے اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے نظم ''بچے کی دعا'' لکھی جس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! میری آرزو ہے کہ میں شمع کی طرح زندگی بسر کروں جس سے دنیا کا اندھیرا دور ہو جائے اور میرے ذریعہ وطن کی زینت بڑھے۔ انہوں نے ''ہمالیہ'' نظم لکھی جس میں ہمالیہ کی عظمت کو بتایا کہ ہمالیہ ہمارے ملک ہندوستان کی حفاظت کرنے والی دیوار ہے۔ وہ ہندوستان کا پاسباں اور نگہبان ہے۔ اس کی عظمت ایسی ہے کہ آسمان جو سب سے اونچا ہے، وہ بھی اس کا احترام کرتا ہے اور جھک کر اس کی پیشانی چومتا ہے۔

انہوں نے ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں کہا کہ یہ ملک خواجہ معین الدین چشتی اور گرونانک کا ملک ہے۔ اس ملک کے باشندوں نے اس طرح علم وہنر اور حکمت وفلسفہ کی بلندی حاصل کی کہ ساری دنیا حیران ہوگئی، یہاں تک کہ یونان بھی حیران ہو گیا جو فلسفیوں کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ یہ تو ایسا ملک ہے جس کی آب وہوا کی تعریف نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی کی ہے۔ اس ملک کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ اس کی زمین پر حضرت نوح کی کشتی کو چین ملا تھا اور وہ ہر طرف سے گردش کھا کر رکی تھی۔ اس ملک کو اس بات کا شرف بھی حاصل ہے کہ یہاں رام چندر اور گوتم بودھ پیدا ہوئے۔ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میرا ہندوستان ساری دنیا سے اچھا ہے۔ یہ ہمارا باغ ہے اور ہم اس کی بلبل ہیں، جس طرح بلبل کو باغ سے محبت ہوتی ہے اسی طرح مجھے بھی اپنے وطن ہندوستان سے محبت ہے۔ میرا باغ بہت خوبصورت، بارونق اور دلکش ہے جسے باغ بہشت بھی رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اقبالؔ کے دل میں وطن کی کتنی محبت تھی اگر کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو وہ ان کی نظم ''صدائے درد'' اور ''تصویر درد'' دیکھے۔ ''صدائے

درد' میں وہ کہتے ہیں کہ آج ہمارے وطن کے ذرّے ذرّے سے نفاق کے چشمے اُبل رہے ہیں، دل ایک دوسرے سے جلا ہے، حالاں کہ سب میں یک رنگی اور اتحاد ہونا چاہئے۔ جب سب ایک ہی کھلیان کے دانے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے جدا کیوں ہیں۔ اقبالؔ چاہتے ہیں کہ سب کے سب ہزار قلب ایک جاں ہو جائیں۔

اپنی نظم ''تصویر درد'' میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے ہندوستان! تیری حالت مجھے رُلا رہی ہے۔ اس ملک کے باشندوں کو کیا ہو گیا ہے جو آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اے ناسمجھ لوگو! اگر تم اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کرو گے تو برباد ہو جاؤ گے۔ فرقہ پرستی چھوڑ دو، سب ایک ہو جاؤ اور تعصب سے دور رہو۔ اگر تم اپنے اور پرائے میں فرق کرو گے اور اس فرق میں خود کو قید رکھو گے تو پھر تمہیں کوئی بھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچا سکتا۔ محبت سے رہو کیوں کہ محبت ہی سے بیمار قوموں کو شفا ملتی ہے۔ وطن کی ترقی چاہتے ہو تو آپس میں لڑنا اور جھگڑنا چھوڑ دو۔ اقبالؔ ہندوستانیوں کو اُس دور کے حالات میں مسلسل بتاتے رہے کہ اگر ہم آپس میں لڑتے رہے تو ملک میں کوئی بھی چیز سلامت نہیں بچے گی۔ آسمان نے تمہاری نااتفاقیوں سے اپنی آستین میں بجلیاں چھپا رکھی ہیں۔ وہ کسی وقت بھی گھونسلوں پر گر سکتی ہیں۔ باغ کے بلبلوں کو چاہئے کہ اپنے گھونسلوں میں غافل ہو کر نہ بیٹھیں۔ اقبالؔ پر کچھ لوگ الزام لگاتے ہیں کہ وہ وطن پرست نہیں تھے اور پاکستان کا تصور ان ہی کا عطیہ ہے، لیکن یہ بات عقل سے بعید، سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو تاریخ سے ناواقف ہے۔

علامہ اقبالؔ انسانی گروہ بندی سے سخت نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستانی بغیر اختلاف من و تو بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں اور ان میں زیادہ سے زیادہ محبت اور ہمدردی ہو، یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہ شخص جو کہے کہ ''وطن کا ہر ذرّہ دیوتا ہے'' اور ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' فرقہ پرست کیسے ہو سکتا ہے۔

بلاشبہ اقبالؔ کا ذہن فرقہ پرستی سے بلند تھا اور وطن کی محبت سے سرشار۔ وطن کی محبت تقاضائے انسانی ہے۔ انسان جس زمین پر پیدا ہوتا ہے اور جہاں رہتا ہے، اس جگہ سے اسے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ جب وطن سے دور جاتا ہے تو اس کا دل اس کی یاد میں تڑپتا ہے۔ اقبالؔ اس تڑپ کو محسوس کرتے تھے، وہ جب ہندوستان سے باہر رہتے تھے تو ان کی روح وطن میں رہتی تھی، وہ کہتے ہیں۔

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو، وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

علامہ اقبالؔ کی حب الوطنی کا جائزہ اگر ہم صدق دل سے لیں تو دیکھیں گے کہ ان کے جیسے بلند نظر و باشعور محبِّ وطن اُس وقت ہندوستانی شعرا، ادبا اور سیاسی رہنماؤں میں کم کم ہی تھے۔ ہاں! انہیں ایسی حب الوطنی کبھی پسند نہیں تھی جو انسان کو انسان کا دشمن بنا دے۔ ایسی حب الوطنی ان کی نگاہ میں مضر تھی۔ ان کی نظر میں فرقہ بندی ایک درخت اور تعصب اس کا پھل ہے۔ حب الوطنی یہی ہے کہ ہر شخص میں محبت کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے اور یہی محبت تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ محبت ایسی شئے ہے کہ اس کی چنگاری سے ہر طرف تجلی نظر آتی ہے۔ انہیں نہ صرف اس ملک کے پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں اور کھیتوں سے پیار تھا بلکہ یہاں کی عوام سے بھی بے پناہ پیار تھا۔ آج بھی اقبالؔ کا نام آتا ہے تو ان کا شعر ہمارے ذہنوں میں گونج اٹھتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

❁❁❁

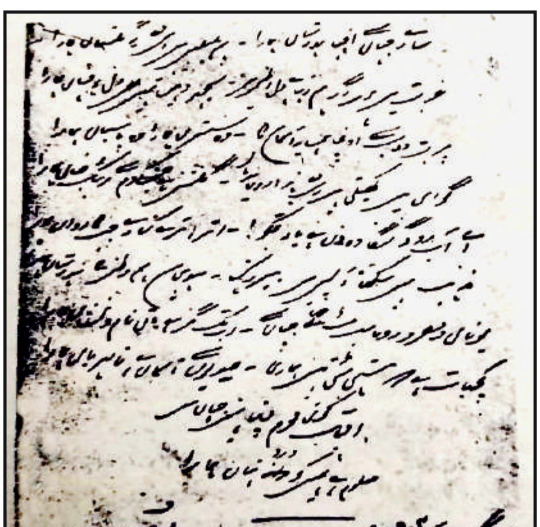

مقالات

ڈاکٹر سید صابر حسن

Hazrat Amir Khusroo Nagar, Near Railway Crossing, Mithanpura,

P.o Ramna, Muzaffarpur-842002 (Mob.9801659311)

عبدالغفور نساخ کی ادبی خدمات

خان بہادر عبدالغفور نساخ جو کہ شعرا اور تذکرہ نگاروں کی صف میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں، جنوری ۱۸۳۴ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام قاضی فقیر محمد تھا۔ قاضی صاحب کی ایک لاجواب تصنیف ''جامع التواریخ'' ہے جو کہ بہ زبان فارسی ۱۸۳۶ء میں چھپی۔ دوسری کتاب ''منتخب النجوم'' ہے۔

سات برس کی عمر میں نساخ کا داخلہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں کرایا گیا اور اسی کم عمری کے زمانے میں انہوں نے شعر موزوں کرنے شروع کئے، جیسا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ذکر کیا ہے۔ ان کی یہ قلمی سوانح حیات ۱۰۶ اوراق پر مشتمل ہے اور ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال میں ہنوز محفوظ ہے۔ عبدالغفور نساخ کی اس قلمی خودنوشت سوانح حیات کو ۱۹۸۶ء میں پروفیسر عبدالسبحان استاد زبان وادبیات فارسی مولانا آزاد کالج کلکتہ نے ایڈٹ کیا ہے جو پروفیسر جگن ناتھ چکرورتی، جنرل سکریٹری ایشیا ٹک سوسائٹی، کلکتہ کے زیر نگرانی تاریخ مذکور کو اشاعت پا چکی ہے۔

نساخ کے جد امجد شاہ عین الدین محمد شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں بغداد سے دہلی آئے اور یہیں سکونت پزیر ہوئے۔ قاضی فقیر محمد کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے عبداللطیف اور عبدالغفور نساخ تھے اور دوسری بیوی سے مولوی عبدالحمید اور مولوی عبدالباری تھے۔

نساخ چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ قاضی فقیر محمد دیوانی عدالت عالیہ کلکتہ میں سرکاری وکیل تھے۔ وہ اٹھائیس برس تک اس عہدے پر مامور رہے اور اپنے منصبی فرائض بڑے سلیقے سے انجام دیتے رہے۔ نساخ جب دس برس کی عمر کو پہنچے تو ان کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ نساخ نے تاریخ وفات کہی۔

مجھ پہ ٹوٹا ہے آسمان غم کا
ہائے میرے جو والدین موئے
کہی تاریخ مجھ سے ہاتف نے
ساکن گلشن بہشت ہوئے

۱۲۵۹ہجری

والدین کے گزر جانے کے بعد نواب عبداللطیف نے نساخ کی سرپرستی کی۔ نواب عبداللطیف اپنے زمانے کے بنگال کے مسلمانوں میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ وہ ڈپٹی مجسٹریٹ اور درجہ اول کے ڈپٹی کلکٹر اور وزیر ریاست بھوپال کے علاوہ بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ نواب عبداللطیف کی نگرانی اور شفقت کے سایہ میں عبدالغفور نساخ نے تعلیم کے اونچے مدارج طے کئے۔ مدرسہ کی ابتدائی تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ۱۸۴۷ء میں ہگلی کالج میں وہ داخل ہوئے۔ یہاں اپنے استاد خواجہ محمد مستقیم کی صحبت میں انہوں نے اشعار موزوں کرنے شروع کئے۔ عبدالغفور نساخ عربی، فارسی، بنگلہ، انگریزی، اردو، ہندی زبانوں سے واقف تھے، لیکن اردو، فارسی اور انگریزی پر انہیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ وہ ایک زبردست انشا پرداز اور بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے۔

سید لطیف الرحمان نے بچپن کی تعلیم کے دوران نساخ کا ایک دلچسپ واقعہ سپرد قلم کیا ہے کہ:

> ''نساخ ساڑھے چار برس کی عمر میں پڑھنے کے لئے بٹھائے گئے۔ مولوی از بر علی صاحب گھر پرآ کر پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب ان کو بے طرح مارتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب کے تشدد کی تاب نہ لاکر روتے ہوئے

اپنے چچا قاضی محمد صابر کے یہاں چلے گئے۔ ساتھ ساتھ مولوی صاحب بھی پہنچے۔ نساؔخ کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور بید لے کر ان کو مارنے آئے۔ اب تو نساؔخ ضبط نہ کر سکے۔ کمرے میں ایرانی تلوار لٹک رہی تھی۔ تلوار سے اُن پر حملہ کرنا چاہا، مولوی صاحب سر پر پاؤں لے کر بھاگنے لگے۔ نساؔخ نے دو تین سو قدم تک دھاوا کیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔'' (''نساؔخ سے وحشتؔ تک'' سید لطیف الرحمٰن، ص ۲۱)

تحصیل علم کے بعد نساؔخ کو بڑی کاوش سے کلرکی کا عہدہ ملا۔ بعد ازاں صدر دیوانی عدالت میں مترجم بحال ہوئے۔ یہاں نساؔخ نے اس قدر محنت و جانفشانی سے کام کرنا شروع کیا کہ ہزار روپے ماہوار کمانے گئے۔ نساؔخ کے دل میں ہمیشہ اونچے عہدے کی تمنا موجزن رہی اور وہ اوائل سے ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کا خواب دیکھنے اور اس عہدے کو حاصل کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں ہوئے۔ ستمبر ۱۸۶۰ء میں ان کے بڑے بھائی نواب عبداللطیف کی کوشش سے ان کو ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ عارضی طور پر مل گیا۔ مستقل طور پر بحال ہونے کے لیے قانون کا امتحان پاس کرنا لازمی تھا، چنانچہ اکتوبر ۱۸۶۱ء میں انہوں نے ڈپٹی کلکٹر کا امتحان دیا، مگر تیاری تشفی بخش نہ تھی اس لئے ناکام ہو گئے۔ دوسری مرتبہ ۱۸۶۲ء میں ایک بزرگ کی دعا اور ایک انگریز نگراں کے تعاون سے کامیاب ہوئے اور ان کے تقرر میں استقلال آ گیا اور اس طرح ان کی دلی آرزو پوری ہوئی۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں وہ ہندوستان کے مختلف مقامات میں تبدیل ہوتے رہے۔ اپنے علاج کے لئے وہ چار دفعہ دلی بھی گئے جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں بڑے پر لطف انداز میں کیا ہے:

''بانکے (بھاگلپور) میں ایک روز میرے سر میں بہت درد تھا اور گلے سے کثرت سے خون آنے لگا۔ دو مہینے کی رخصت لے کر کلکتہ آیا اور وہاں سے ۱۲۸۴ھ کے ماہ رمضان المبارک میں علاج کے لئے دہلی گیا۔ پٹنہ، الہٰ آباد اور علی گڑھ میں ایک ایک دن ٹھہر کر دہلی پہنچا اور وہاں حکیم غلام مرتضٰی خاں صاحب سے علاج کرایا اور بخوبی آرام ہوا۔ دہلی میں مفتی صدرالدین خاں بہادر آزردہؔ، نواب ضیاالدین خان صاحب، نیرؔ و درخشاںؔ اور ان کے صاحبزادے نواب شہاب الدین خاں ثاقبؔ اور نواب سعدالدین، احمد خاں صاحب، طالبؔ اور منشی امین الدین خان صاحب، معروف بہ عمو اور بخشی، انعام اللہ خان صاحب اور مرزا اسداللہ خان صاحب خیر آبادی و مولوی الطاف حسین حالیؔ اور نواب غلام حسین خان صاحب محوؔ مراؤ، مرزا نورو نواب، مرزا اطہر و خواجہ اماں صاحب و شہزادہ مرزا الٰہی بخش و خواجہ بدرالدین مہرکن، میاں غلام نظام الدین صاحب ابن میاں کالی صاحب سے ملاقات ہوئی اور سب مجھ سے از حد مہربانی سے پیش آئے۔ حکیم محمود خان صاحب و حکیم مرتضٰی خان صاحب سے بہتر طبیب نہیں دیکھا۔ مرزا غالبؔ نے ایک دن مجھ سے کہا 'مولوی صاحب! معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سات آٹھ سال کی عمر سے شعر کہتے ہوگے۔' میں نے کہا 'ہاں' عید کے دن مرزا صاحب نے اپنی مثنوی 'ابر گہر بار' کے تین چار شعر میرے سامنے پڑھے۔ اس پر اہل دہلی کو تعجب ہوا، کیوں کہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تھا، وہ خفا ہو جاتے تھے۔ نواب ضیا الدین صاحب سے بہتر مورخ مسلمانوں میں نظر نہیں آیا اور نواب مصطفٰے خاں سا مہذب آدمی میں نے دیکھا نہیں۔ کبھی انہوں نے اپنے مکان پر مجھ کو پڑھنے کو نہیں کہا، بلکہ اپنے مکان پر خود اپنے شعر سناتے تھے اور جب میرے مکان پر آتے تھے تو مجھے شعر پڑھنے کو کہتے تھے۔ دہلی میں کئی مشاعروں میں بھی شریک ہوا اور بڑا لطف اُٹھایا۔ دہلی کے حیدر خاں قوال نے میری کئی غزلیں یاد کیں اور حضرت امیر خسروؔ علیہ الرحمہ کے عرس کے دن

حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے مزار پر ان غزلوں میں سے بعض غزلیں گا رہا تھا کہ میں بھی وہاں پہنچا اور اپنی غزل سن کر دل کو ایسی خوشی ہوئی کہ بیان کر نہیں سکتا۔ ایسی خوشی مجھ کو عمر بھر کبھی نہ ہوئی تھی، حالاں کہ میں نے غزلوں کو بہت سی طوائفوں کو گاتے سنا تھا۔ میں دہلی میں تین مہینہ رہ کر صحت یاب ہو کر آگرہ آیا اور ڈاکٹر اشرف علی کے مکان پر ٹھہرا اور روضہ ممتاز محل معروف بہ تاج محل و مزار اکبر شاہ بادشاہ کی زیارت کی اور قلعہ و شہر دیکھ کر کانپور ہو کر لکھنؤ پہنچا اور چوک میں ایک سہ منزلہ مکان کرایہ پر لے کر ٹھہرا اور وہاں اشرف الامرا مدارس و آغائی صاحب و داروغہ واجد علی صاحب و سلطان طہماسب مرزا صفوی صاحب سے جو میری بیوی کے رشتہ میں بھائی تھے، ملاقات ہوئی۔ شیخ امداد علی مجرؔد، عبداللہ خاں مہرؔ وغیرہ شعرا سے و شیخ احمد بخش سوداگر سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن میں آغائی صاحب کے مکان گیا۔ وہاں بہت سے لوگ مجتمع تھے اور ایک مقدمہ کا ذکر تھا۔ اس میں وہاں کے وکلا و ممتاز نے ایک رائے دی اور آغائی صاحب کے پوچھنے پر میں نے ان لوگوں کے خلاف رائے دی اور میرے رہتے رہتے وہاں کے حاکموں نے بھی وہی رائے دی جو میں نے دی تھی۔ لکھنؤ میں قیصر باغ وغیرہ جو عمارتیں قابل دیکھنے کی تھیں، دیکھیں۔ یہاں اکثر لوگ زبانی محبت دکھاتے ہیں، لیکن دل میں کچھ نہیں۔ لکھنؤ کے لوگ باتیں خوب بناتے ہیں۔ لکھنؤ میں ۱۲۸۵ھ کا محرم ہوا اور حسین آباد کی بہت عمدہ روشنی دیکھنے میں آئی۔ میں نے محرم میں ایسی روشنی کہیں نہیں دیکھی تھی، میں آغائی صاحب داروغہ واجد علی کے مکان میں مجلسوں میں بھی شریک ہوا۔ کربلا میں بھی گیا تھا، ایسی تعزیہ داری کہیں بھی نہیں دیکھی تھی اور اتنے تعزیے بھی نہیں دیکھے تھے۔''

نساؔخ جنوری کے شروع میں ۱۸۶۴ء میں علاج کے لئے دوسری مرتبہ دہلی تشریف لے گئے اور پھر کچھ دنوں کے بعد تبدیل آب و ہوا کے لئے تیسری دفعہ دہلی گئے۔ اس سفر میں لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس کی بھی سیر سے لطف اندوز ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں چوتھی بار علاج کی غرض سے دہلی گئے۔ داغؔ دہلوی سے ان کی ملاقات ہوئی اور بڑی پر لطف صحبت رہی۔ نساؔخ جس طرح اعلیٰ نوکری حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدہ کو حاصل کر کے ہی دم لیا، اسی طرح انہیں ادبی شہرت کی بھی تمنا تھی۔ انہوں نے بیسوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ اہل دہلی کے اخلاق و عادات سے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے، چنانچہ ایک رباعی میں ان کی مدح سرائی یوں کرتے ہیں ۔

خوش پوش ہیں سارے مردمانِ دہلی
کیا شستہ و رُفتہ ہے زبانِ دہلی
ہے رشک بہشت گلستانِ دہلی
بہتر ہے بہار سے خرانِ دہلی

نساؔخ Chess کے اچھے کھلاڑی تھے۔ وہ کھانا پکانے کے فن سے بھی واقف تھے۔ اکرام احمد ضیغؔم جو کہ اردو شاعری کے استاد ہی نہیں بلکہ مختلف فنون اور سائنس کے بھی ماہر تھے، نساؔخ کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ضیغؔم ان کے کلام کی اصلاح کرتے تھے، نساؔخ ایک باغ و بہار انسان تھے، انہوں نے ڈپٹی مجسٹریٹ کے جلیل القدر عہدہ کے فرائض کو بہت حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے زمانے میں بڑے مضبوط افسر ہوئے۔ سید لطیف الرحمٰن اپنی تصنیف ''نساؔخ سے وحشتؔ تک'' میں صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں:

> ''۱۸۶۴ء میں نساؔخ نے مرزا ہمایوں بخت ابن مرزا خرم بخت ابن مرزا جوان بخت معروف بہ مرزا دارشاہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی دختر نیک اختر سے شادی کی، اس وقت ان کی عمر انیس بیس برس کی تھی۔''

نساؔخ کے شخصی کمالات کا اعتراف شمبھو چندر مکھری مدیر ہفت روزہ ''رئیس اور رعیت'' کلکتہ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''عبدالغفور نساؔخ اپنے عہد کے ان معروف ادیبوں میں ہیں، جن کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ انہیں اس مقام

بلند تک پہنچانے میں جن محرکات نے بھرپور تعاون کیا
ان میں وراثت اجداد اور نساؔخ کے عزم بلند کو خاصی
اہمیت حاصل ہے، لیکن یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح
عیاں ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور فروغ وارتقا
میں متعلقہ عہد کی روش، اساتذہ کا ذہنی و علمی معیار،
احباب و مشاہیر علم و فن کے بھی مثبت اثرات رہے ہیں۔
یہی سبب ہے کہ نساؔخ کی حیثیت مجموعہ کمالات کی ہے۔''

انھوں نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں عبدالغفور نساؔخ کے اوصاف کی مزید وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"Abdul Ghafur Nassakh was an able and conscientious public servant. In private, he was not only most amiable, polite and simple, but a man of purest life. He was man of true piety and incorruptible integrity a genuine chip of the old block of Islam."

(Reis and Raiyyat, 15 june 1889)

خان بہادر عبدالغفور نساؔخ کے ادبی کارناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے، اس کی روشنی میں ان کی تصانیف کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سخن شعرا

''سخن شعرا'' تقریباً دو ہزار چار سو چھیالیس اردو شعرا اور اڑتیس شاعرات کا اردو میں مختصر تذکرہ ہے جس کی اشاعت اکتوبر ۱۸۷۴ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے ہوئی اور اس میں نساؔخ نے ان کے کلام کے اوصاف بھی بیان کئے ہیں۔

نساؔخ نے اپنی اس کتاب میں بنگال کے کئی ایسے شعرا کے بھی حالات قلم بند کئے ہیں جو گمنامی میں تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے معروف و مشہور شعرا کے تذکرے مختصر طور پر کئے ہیں، مثلاً آتؔش کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

''اشعار ان کے پُرمضمون اور بامزہ ہوتے ہیں۔''

میر اثؔر کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''اشعار ان کے پُردرد ہوتے ہیں۔''

انشا اللہ انؔشا کے متعلق اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

''مشکل قافیوں میں شعر عاشقانہ اچھا کہتے ہیں۔''

میر حسؔن کے متعلق لکھا ہے کہ:

''شعر پُرمزہ اور دشوار انگیز خوب کہتے ہیں۔ 'مثنوی بدر منیر' (سحرالبیان) لاجواب کہی ہے۔''

ابراہیم ذوؔق کے تعلق سے کہتے ہیں کہ وہ:

''جمیع اصناف سخن پر قادر تھے۔ مضامین تازہ و عالی و عاشقانہ خوب باندھتے تھے۔''

مومن خاں مومؔن کے متعلق ان کی رائے یوں ہے:

''جمیع اصناف سخن پر قادر تھے۔ اشعار ان کے پُرمضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں۔ راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں۔''

میؔر کے متعلق یوں کہتے ہیں:

''میؔر سوائے قصیدہ کے جمع اصناف سخن پر قادر تھے۔ اشعار ان کے بغایت رتبہ بلند رکھتے ہیں۔ فرطِ اشتہار سے حاجت نہیں۔ مثنوی و غزل گوئی میں استاد مسلم الثبوت گزرے۔ ان کی استادی سے کسی کو انکار نہیں، جو درد ان کے کلام میں ہے، کسی شاعر ریختہ کے کلام میں نہیں۔''

غالبؔ کا ذکر نساؔخ نے اپنے اس تذکرہ میں یوں کیا ہے:

''طبیعت ان کی بہت دشوار پسند ہے۔ اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوؔری ترشیزی اور مرزا عبدالقادر کے ہم پہلو ہوتے ہیں۔ اشعار اردو میں بھی وہی انداز ہے۔ اوائل میں اردو غزلوں میں اسؔد تخلص کرتے تھے۔ بڑا عرصہ ہوا کہ کلکتہ میں بھی آئے تھے۔ راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ کلیات ان کا نظر سے گزرا۔ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔''

زبان ریختہ

نساؔخ شاعر ہی نہیں نثر نگار بھی تھے۔ ''زبان ریختہ'' نثر میں نساؔخ کا مختصر تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی اشاعت ۱۲۷۵ھ میں ہوئی۔ یہ

کتاب ناسخ کے ذوقِ تحقیق وجستجو کا بین ثبوت ہے۔

دفتر بے مثال

ناسخ کا پہلا اردو دیوان ''دفترِ بے مثال''، مطبع مظہر العجائب کلکتہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس دیوان کی غزلوں پر لکھنوی رنگ غالب ہے اور ناسخ نے لکھنوی شاعر ناسخ کے دیوان ''دفتر پریشاں'' سے متاثر ہو کر شعر کہے ہیں۔ نمونہ کلام ہدیہ ناظرین ہے۔

پوچھو نہ حال گرمیٔ حسن شباب کا
ہے دوپہر کو گرم مزاج آفتاب کا
اس مست حسن کی جو پڑی آنکھ نشہ میں
لبریز کیوں نہ مے سے ہو ساغر حباب کا
سونے دیا نہ حسرت دیدارِ یار نے
آیا خیال وصل کی شب جو خواب کا
ہو صبح دم جو بام پہ وہ ماہ جلوہ گر
خورشید پر گمان ہو آئینہ دار کا
جوشِ جنوں میں زار جو ناسخ ہو گیا
طوقِ گلو بنا ہے گریباں کے تار کا

حضرت ناسخ نے اس دیوان کا ایک نسخہ غالب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اسے پڑھ کر غالب بے حد مسرور ہوئے اور اپنے تاثرات کو اپنے ایک خط میں جو کہ انہوں نے ناسخ کو لکھا تھا، یوں تحریر کیا ہے:

''دفترِ بے مثال' کو عطیۂ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یادآوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچ میرز، ہیچ مداں کو قابل خطاب و لائق کتاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمّٰی ہے 'دفترِ بے مثال' اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند، ہم فقیر لوگ اعلائے کلمۃ الحق میں بیباک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے، آپ ان سے بڑھ کر بصیغہ مبالغہ بے مبالغہ ناسخ ہیں۔ تم دانائے رموز اردو زباں ہو، سرمایہ نازش، قلمرو ہندوستان ہو۔''

غالب کی اس مذکورہ تحریر سے ناسخ کی عظمت شعری کا پتہ چلتا ہے۔

اشعار ناسخ

''اشعار ناسخ'' ناسخ کا دوسرا دیوان ہے، جو کہ ۱۸۷۴ء کو طبع ہو کر لکھنؤ نول کشور پریس سے منظر عام پر نمودار ہوا۔ اس کا طرز بھی لکھنوی رنگ لئے ہوئے ہے، چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں۔

واہ وا کیا پر اثر نقش محبت ہو گیا
وہ ملے غیروں سے مجھ سے ترک الفت ہو گیا
وہ مسیحا قبر پر آیا تو جاگے میرے بخت
مجھ کو خواب مرگ گویا خواب راحت ہو گیا
جس پری وش کو بھی دیکھا میری الفت میں پھنسا
سینۂ صد چاک بھی دامِ محبت ہو گیا
مجھ سے قیس و کوہ کن درس جنوں لیتے رہے
داغِ سودا سر پہ دستار فضیلت ہو گیا
کر دیا ناسخ جو کشت دلِ دشمن کو سبز
آبِ اشک چشم گویا آبِ رحمت ہو گیا

دیکھئے چلتی ہے کس پر تیغ خانہ ساز دوست
کس کی جانب پہلے پھرتی ہے نگاہِ ناز دوست
دشمنوں سے کب اٹھے بارِگران ناز دوست
مرد اس میدان کے ہیں عاشق جانباز دوست
ہیں نشانہ اک نگہ میں لاکھوں ہی آہوئے دل
ہے شکار افگن بلا کی چشم تیر انداز دوست
ایسے چپ ہوتے کہ بس گویا زباں منہ میں نہ تھی
دیکھ لیتے حضرتِ عیسیٰ اگر اعجازِ دوست
بوسہ دے کے بولے وہ ظاہر نہ ہو رازِ دہن
دوست کو لازم نہیں افشا جو کر دے رازِ دوست
دیکھ لینا وصل کی شب کو کہیں آنے تو دو
جان تک ناسخ ہم کر دیں گے صرفِ نازِ دوست

ارمغان

حضرت نساؔخ کا تیسرا دیوان ’’ارمغان‘‘ ہے جو اساتذۂ دہلی کے رنگ شاعری میں تصنیف ہوا ہے۔اس کی اشاعت نظامی پریس سے۱۸۷۷ء میں ہوئی۔چند اشعار پیش ناظرین ہیں ۔

گاتے ہیں وہ اور وجد میں ہیں سارے اہل بزم
کیا کام کر رہی ہے یہ آواز دیکھنا
پہلو سے دل کو لے گئے وہ کھینچ کھینچ کر
جذبِ نگاہِ چشم فسوں ساز دیکھنا
کہتا ہے یار طنز سے نساؔخ آج کل
کرتا ہے شاعری پہ بہت ناز دیکھنا

نساؔخ ان کے آنے کی شاید خبر ہے آج
رشک بہار رونق دیوار و در ہے آج

ارمغانی

’’ارمغانی‘‘ عبدالغفور نساؔخ کا چوتھا دیوان ہے جس کی اشاعت۱۳۰۲ھ میں ہوئی۔ یہ بھی اساتذۂ دہلی کے رنگ میں تصنیف ہوا۔نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

جس نے تری بے باک ادا کو نہیں دیکھا
واللہ کہ آنکھوں سے قضا کو نہیں دیکھا
کیوں مجھ کو سناتے نہ بھلا قصۂ جنت
واعظ نے تری مہر و وفا کو نہیں دیکھا
کیوں حضرتِ موسیٰ کی طرح غش میں ہو نساؔخ
گر تم نے بت ہوش رُبا کو نہیں دیکھا

مرغوب دل

’’مرغوب دل‘‘ نساؔخ کی فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے جو ۱۱۲ فارسی رباعیات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ اس کی پہلی رباعی یوں ہے ۔

یارب شدہ ام تبہ بیامرز مرا
شد روی دلم سیہ بیامرز مرا
دردا کہ بجز گنہ نہ کردم کاری
بخشندۂ ہر گنہ بیامرز مرا

شاھد عشرت

’’شاہدعشرت‘‘ میں نساؔخ نے معشوق کی شبیہ کی شاعرانہ تصویر کشی کی ہے۔اس کی اشاعت۱۲۹۱ھ میں ہوئی۔۱۸۶۴ء میں ’’شاہد عشرت‘‘ کے سننے کے لئے مٹیا برج میں ایک بزمِ مشاعرہ منعقد ہوئی تھی۔سامعین سن کر بہت محظوظ ہوئے۔نمونۂ کلام یوں ہے ۔

ہے آفت جاہ بلا وہ قامت
یا کہیئے نمونۂ قیامت
وہ سر پہ دوپٹہ آسمانی
عاشق کو بلائے آسمانی

گنج تواریخ

’’گنج تواریخ‘‘ نساؔخ کے کہے ہوئے قطعات تاریخی کا مجموعہ ہے، جس کی اشاعت ۱۲۹۰ھ میں ہوئی۔ بہت سے مشاہیر کی تاریخ وفات کہی ہے۔قطعات فارسی میں ہیں۔

کنزالتواریخ

’’کنزالتواریخ‘‘، ’’گنج تواریخ‘‘ کا ضمیمہ ہے جس کی اشاعت۱۲۹۴ھ میں ہوئی۔تین قطعات تاریخ اردو میں ہیں اور باقی زبانِ فارسی میں کہے گئے ہیں۔

قندِ فارسی

’’قندفارسی‘‘نساؔخ کی فارسی اشعار کی بیاض ہے جوکہ ۱۸۷۲ء میں نول کشور لکھنو سے شائع ہوئی۔نساؔخ کی یہ بیاض فارسی شعراکے تذکرے سے متعلق ہے۔

قطعه منتخب

’’قطعہ منتخب‘‘ مختلف شعرائے اردو کے اچھے قطعات کا مجموعہ ہے،جس کی اشاعت ۱۲۷۶ھ میں ہوئی۔

چشمۂ فیض

’’چشمہ فیض‘‘ پندنامہ عطاؔر کا منظوم اردو ترجمہ ہے جوکہ جون۱۸۷۴ء میں منظرعام پر آیا۔نمونۂ ترجمہ اردو قابل ملاحظہ ہے ۔

جو کہ ہووے اہل ایماں اے عزیز
پاک رکھے چار شے سے چار چیز
پاک کر دل کو حسد سے اے پسر
پھر سمجھ اپنے کو مومن بے خطر
پاک رکھ تو کذب و غیبت سے زباں
تا نہ ہو ایمان کو تیرے زیاں
گر عمل کو رکھے ریا سے پاک ابھی
شمع ایماں کو ہو تیری روشنی
گر نہیں تیرے شکم میں ہے حرام
صاحب ایماں ہے پھر تو لاکلام

منتخابات دواوین شعرائے ہند

اساتذۂ اردو کی چیدہ غزلوں کو ردیف وار اکٹھا کر کے ناسخ ''منتخابات دواوین شعرائے ہند'' کو دیوان کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔اس کی طباعت کا سال ۱۸۶۴ء ہے۔

نصرۃ المسلمین

''نصرۃ السلمین''ناسخ کی مذہبی رباعیات کا مجموعہ ہے جو کہ مومن خاں مومن کی طنزیہ مذہبی رباعیات کے جواب میں تصنیف ہوئی ہیں۔اس کی اشاعت ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔

انتخاب نقص

ناسخ کے''انتخاب نقص''میں انیس ودبیر کے کلام کے فنی ومعنوی نقائص کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔اس کی اشاعت ۱۲۹۴ھ میں ہوئی۔

سوانح عمری نسّاخ

ناسخ کی خودنوشت سوانح حیات (قلمی) جو کہ مغربی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی ملک ہے،اس میں انہوں نے اپنے خاندانی اور ذاتی حالات وواقعات بڑے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ اس تصنیف کو پروفیسر عبدالسبحان کلکتہ نے اپنے انگریزی دیباچہ کے ساتھ ایڈٹ کیا اور ایشیاٹک سوسائٹی ،کلکتہ کے زیر نگرانی ۱۹۸۶ء میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ جب پروفیسر موصوف مذکورہ خودنوشت کو ترتیب دے رہے تھے تو اتفاقاً ایک روز ایشیاٹک سوسائٹی ،کلکتہ میں میری اُن سے ملاقات ہوئی،تو میں نے عبدالغفور نسّاخ کے دو قلمی خطوط کا اُن سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ دونوں خطوط مجھے میرے عم محترم ڈاکٹر سید اختر حسن،ایم۔اے،پی ایچ۔ڈی کلکتہ کے توسط سے دستیاب ہوئے تھے جو کہ نواب سید محمد آزاد کو تحریر کئے گئے تھے۔ یہ ان کے ایک قدیمی صندوق میں موجود تھے۔ان دنوں میری تحویل میں ہیں چونکہ سوانح عمری نسّاخ قلمی بہت قدیم ہے اور اُن کی اپنی تحریر میں ہے،اس لئے خطوط کی تحریر سے مشابہت ثابت ہوئی اور اس قلمی نسخہ کی authenticity کے لئے خطوط کا عکس کتاب مذکور میں چسپاں کردیا اور اس کا تذکرہ بھی کتاب میں کیا۔ان دنوں راقم الحروف ایس۔ایل کے کالج، سیتامڑھی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھا۔خطوط کے لفاف پر ۱۸۸۸ء کی تاریخ درج ہے۔

نصاب زبانِ اردو

نسّاخ نے یہ کتاب کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے ترتیب دی تھی۔ یونیورسٹی سے ۱۸۶۴ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔

منتخب چشمہ فیض

یہ کتاب نسّاخ کے''چشمہ فیض'' کا مختصر انتخاب ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۸ء میں زیورِطباعت سے آراستہ ہوئی۔

منتخب دواوین شعرائے ہند

یہ کتاب بھی مختلف شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ کتاب

ٹائپ میں کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۴ء میں چھپی۔ خان بہادر عبدالغفور نساؔخ اردوادب کے مایہ ناز نثر نگار کے علاوہ ایک شہرۂ آفاق شاعر بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے زبان شعروادب کے چمن میں اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود بڑے خوشنما اور دیدہ زیب گل بوٹے کھلائے۔ اردوشاعری کی دنیا میں ان کی شخصیت بڑی معروف ہے۔ وہ ایک وہبی شاعر تھے اور اس کے ساتھ انہوں نے مشق سخن بھی خوب کی تھی۔ تحصیل علم کے بعد روزی کی تلاش میں وہ کافی دنوں سرگرداں رہے جب ایک زمانے تک انہیں کوئی ملازمت نہیں ملی تو فرصت کے اوقات میں بزرگ شعرا کے کلام کا وہ دلچسپی سے مطالعہ کرنے لگے جس کے سبب زبان وادب میں اچھی خاصی مہارت حاصل ہوگئی اور شعر گوئی کا جذبہ تیزی سے اُن کے اندر پروان چڑھا۔ کچھ دنوں تک ان کے کلام کی اصلاح مولوی رشید النبی وحشتؔ کرتے رہے بعدازاں اپنے استاد کے استاد حافظ محمد اکرام ضیغمؔ رامپوری کے حلقہ شاگردی میں شامل ہو گئے اور بہت جلد رموزفن ونکاتِ شعری میں کامل دستگاہ حاصل کرلی اور ان کے کلام میں پختگی آ گئی۔ نساؔخ بڑے زودگو و پرگو واقع ہوئے تھے، چنانچہ تھوڑے زمانے میں چودہ ہزار شعر کہہ ڈالے، جب اس قدر اشعار جمع ہوگئے تو دوستوں کے اصرار پر انہوں نے اپنا پہلا دیوان ۱۲۷۵ھ میں منظر عام پر پیش کیا۔ غالبؔ کی اس قیمتی رائے:

> ''دفتر بے مثال اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔ تم دانائے رموز اردو زبان ہو، سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو۔''

سے نساؔخ کے کلام کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اور اپنے معاصرین شعرا کی صف میں وہ ایک اونچے مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی تصنیف ''انیسویں صدی میں بنگال کا اردوادب'' صفحہ ۵۲۳ میں نساؔخ کے مجموعہ کلام ''دفتر بے مثال'' پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''یہ نساؔخ کا پہلا دیوان ہے جو ۱۲۷۶ھ میں شائع ہوا۔ چونکہ نساؔخ اور لکھنوشعرا کے درمیان ہمیشہ نوک جھونک ہوتی رہی اور کئی ادبی معرکے بھی ہوئے، اس لئے ناسؔخ لکھنوی کے دیوان 'دفتر پریشان' کے جواب میں نساؔخ نے 'دفتر بے مثال' ترتیب دیا ہے۔ 'دفتر بے مثال' کی غزلوں میں لکھنوی رنگ وآہنگ ہے۔ ان کی غزلیں اتنی کامیاب ہیں کہ غالبؔ جیسا شاعر بھی اُس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ نساؔخ نے بنگال میں اردوشاعری کی دنیا میں ہلچل پیدا کی تھی۔ شاعری کو مقبول بنانے میں اتنا بڑا حصہ تھا جس نے غالبؔ کے انداز میں شاعری کی اور جن کے قلم سے کئی پاکیزہ اشعار نکلے۔ نساؔخ بلاشبہ بنگال کے سب سے بڑے اور منفرد ادیب وشاعر ہیں۔ یہ ان کی ذات ہی تھی جو شمالی ہندوستان میں اس خیال کو جھٹلا سکی ہے کہ بنگالیوں کو اردو سے کوئی شغف نہیں اور ان کی زبان بھی غلطیوں سے مملو ہوتی ہے۔''

باشندہ بنگال ہوکر زبان و بیان پر نساؔخ کو عبور حاصل تھا۔ وہ ایک کامل الفن شاعر وادیب کی حیثیت سے اپنے ہمعصر شعرا میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ نساؔخ کی غزلوں میں عشق وحسن کی معاملہ بندی بڑے دلکش پیرائے میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کی رومانی غزلیں سوز وگداز، درد وتاثیر سے سراسر لبریز نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری کا رومانی پہلو اپنے اندر بڑی دلکشی وتابانی لئے ہوئے ہے۔ داغؔ کے کلام سے بھی وہ بے حد متاثر ہوئے تھے، چنانچہ داغؔ کی رومانی شاعری کی جھلک نساؔخ کے کلام میں ملتی ہے۔ چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں ؎

اس مست حسن کی جو پڑی آنکھ نشہ میں
لبریز کیوں نہ مے سے ہو ساغر حباب کا
بے یار میکدے پہ گماں غمکدے کا ہے
ہر جام مے میں طور ہے چشم پر آب کا

نسؔاخ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کا بیان بھی بڑی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔انہوں نے اردو شاعری کے دامن کو اپنے اچھوتے خیالات نئی نئی تشبیہوں اور تلمیحات سے مالا مال کیا۔

نسؔاخ کی فطرت میں شعر گوئی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔انہوں نے کئی دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن میں ان کے حکیمانہ اور فلسفیانہ تصورات کا بڑا سنجیدہ بیان ملتا ہے۔سید لطیف الرحمٰن نے اپنی تصنیف ''نسؔاخ سے وحشؔت تک'' صفحہ ۵۶ میں نسؔاخ کے اولین دیوان ''دفتر بے مثال'' کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے:

''دفتر بے مثال' اگر چہ کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ ہے، لیکن اس گلدستہ میں ایسے پھولوں کی کمی نہیں جو شاعرانہ آرٹ کے وہ کرشمے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر دل بھی مزا لینے لگتا ہے۔''

۴؍جون ۱۸۸۹ء میں اردو ادب اپنے چمن کے اس قیمتی باغباں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔نسؔاخ کے شاگرد قاضی عبدالحمید حمؔید محمڈن میرج رجسٹرار نے ایک قطعہ میں نسؔاخ کا سالِ وفات یوں رقم کیا ہے۔

روز جمعہ چاردہ تاریخ بود از ماہِ جون
شد بہ کلکتہ بپا ہنگامہ محشر نما
اوستاد و مشفق و غم خوار جانِ دردمند
اہل دل اہل ہنر اہل سخن اہل سخا
بست از دار غم رنج و محن رخت رحل
شد خرامان شادمان سوی گلستانِ بقا
عیسوی تاریخ فوت اور رقم کردہ حمؔید
مولوی عبدالغفور اہل حشم جاہ و ادا
۸۹ ء ۱۸
سالِ فوتش گفت در ہجری سروش
شاعر جنت مکاں ، نیک نام
۰۶ ھ ۱۳

(باغ فکر معروف بہ مقطعات نسؔاخ، مرتبہ محمد خالد عابدی)

نسؔاخ کی وفات کے سلسلے میں پروفیسر عبدالسبحان خودنوشت سوانح حیات نسؔاخ کے اپنے انگریزی دیباچہ صفحہ ۱۲ میں لکھتے ہیں:

"Nassakh returned on the first of February 1889 completing 55 years of age and died at Calcutta on Friday of June 1889. His tomb is situated on a plot of land of the park circus maidan in south-east Calcutta."

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان و ادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ازراہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔شکریہ!

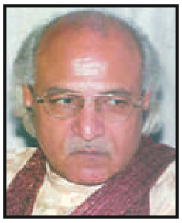

ڈاکٹر نریش

169, Sector-17, Panchkola-134109 (Mob.9417365676)

جدید افسانے پر ایک نظر

جدید افسانے میں علامتی اور تجریدی رجحان دور حاضر کی اس ذہنی نا آسودگی کی دین ہے، جو آج کے انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری سماجی زندگی ہوا میں لٹک گئی ہے۔ ہم نہ مشرقی ہی رہے ہیں اور نہ مغربی ہی بن سکے ہیں۔ یہ عبوری دور ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے، بلکہ اب حالت یہ ہے کہ یہ عبوری دور اختتام پذیر ہوتا نظر نہیں آ رہا ہے، لہٰذا افسانے کے سپاٹ ہونے کی گنجائش کم ہو گئی ہے۔ آج کا قاری ایک مصروف انسان ہے اور اپنے معاشرے سے کٹا ہوا ہے۔ وہ لمبی چوڑی داستان نہیں سننا چاہتا، اپنے مطلب کی بات پکڑنا چاہتا ہے، غرض اس کے لئے اشارہ ہی کافی ہے۔

نئے لکھنے والوں نے افسانے کی تکنیک بدلی ہے، اس میں شک نہیں، مثلاً منشی پریم چند کے زمانے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ افسانہ اپنی روایتی ہیئت سے گریز کر سکتا ہے۔ دور جدید میں بیسیوں ایسی کہانیاں لکھی گئی ہیں، جن میں پلاٹ کا تانا بانا بننے کے بجائے افسانہ نگار نے زندگی کے اس ایک یا ایک سے زائد اُن لمحات کو پکڑنے کی کوشش کی ہے، جو عام طور پر ہمارے ہاتھ سے پھسل جاتے ہیں۔ پرانی کہانی ایک ماحول، ایک زندگی کا احاطہ کرنے کی فکر میں رہتی تھی، جدید کہانی یہ فرض کر کے چلتی ہے کہ ماحول کا تصور قاری کے لئے مشکل نہیں ہے، صرف اس کو اپنے اندر کا کھوکھلا پن دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پرانی کہانی مرض کی تشخیص بھی کرتی تھی اور اس کا علاج بھی سجھاتی تھی۔ جدید کہانی علاج کی بھول بھلیاں میں پڑنے سے عاری ہے، بلکہ باغی ہے، یہ صرف مرض کی نشاندہی کرتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو کے تمام افسانہ نگار روایت سے گریز کر کے افسانہ نگاری کر رہے ہیں۔ آج بھی بہت سی کہانیاں ایسی لکھی جا رہی ہیں جو خالص روایتی کہانیاں ہیں، مگر زیادہ تر ایسی کہانیاں ہیں جو روایت سے وابستگی کے باوجود عصری تقاضوں سے جڑی ہوئی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر جدید افسانہ روایت سے یکسر کٹ جائے گا تو اسے مقبولیت حاصل نہ ہوگی۔ خیالات کی بے ربطی اور ناہمواری ہی کو جدیدیت کہنا غلط ہے۔ جدیدیت کے شوق میں اگر کچھ نئے لکھنے والے ایسا کر رہے ہیں تو میں اس کو بھی غیر فطری نہیں سمجھتا۔ ہر نئی تحریک کے اندر ایک کشش ہوتی ہے اور کئی لوگ بھاگ کر اس دوڑ میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کو مقبولیت حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد سے لکھے گئے افسانے میں فن اور فکر کی تلاش بے معنی ہوگی۔ بعض ناقدین نے تخلیقی افسانے کی بات کی ہے۔ میں اس اصلاح کو قبول کرنے سے قاصر ہوں، کیوں کہ افسانہ غیر تخلیقی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ سوچنا کہ جدید افسانوں کی بھیڑ میں پریم چند یا کرشن چندر کے افسانے گم ہو جائیں گے، غلط سوچ ہے۔ پریم چند کے افسانے اردو ادب کی تاریخ کا وہ حصہ ہیں کہ اگر انہیں خارج کر دیں تو تاریخ ادب ہی مجروح ہو جائے گی۔ ہاں، مگر یہ اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ پریم چند کا دور ختم ہو چکا ہے۔

آج کے بدلے ہوئے زمانے، بدلے ہوئے ماحول اور بدلے ہوئے طرز زندگی کو پریم چند یا کرشن چندر کے افسانوں میں تلاش کرنا بھی بے سود ہے۔ ان افسانہ نگاروں کی کہانیاں انسان کی زندگی کی کہانیاں ہیں، انسان کے ذہن کی کہانیاں نہیں ہیں، جب کہ جدید افسانہ جسم کے بجائے ذہن کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔

جدید افسانے کی مقبولیت سے پریم چند یا کرشن چندر کے افسانوں کی تاریخی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا، نہ ان کی اہمیت پر حرف آتا

(بقیہ ص ۵۴ پر)

ڈاکٹر داؤد احمد
Deptt. of Urdu, Fakhruddin Ali Ahmad Govt. P.G. College, Mahmudabad, Sitapur
(Uttar Pradesh) (Mob. 8423961475)

اردو میں ناولٹ نگاری

ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی اہم مسئلہ اور اس کے خاص پہلوؤں کا مختصراً جائزہ لیتا ہے جس کی اپنی الگ تنظیم ہوتی ہے اور وہ ناول سے قدرے مختصر، مگر طویل افسانے سے زیادہ طویل اور تفصیلی ہوتا ہے۔

ناولٹ بھی ناول کی ایک شاخ ہے۔ وہ ناول سے ایسا کچھ زیادہ مختلف نہیں، بلکہ ناول کے فنی ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ناولٹ قصہ گوئی کے فن میں ایک جدت طرازی اور تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے نئے پیدا ہونے والے نئے فنکارانہ شعور نے اس کی تخلیق کی ہے۔ اس کی ایک مخصوص ہیئت ہے اور وہ پڑھنے والوں پر ایک خاص طرح کا اثر ڈالتا ہے۔

اردو ادب میں ناولٹ ایک اہم اور مقبول صنف کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ ناولٹ ہیئت کے لحاظ سے ناول سے بہت قریب ہے۔ کوئی بھی ادب خلا میں پرورش نہیں پاتا، ادیب اپنا اظہار اپنی تخلیق کے توسط سے کرتا ہے۔ دوسری اصناف کے بہ نسبت ناولٹ میں مقصد ابھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، چونکہ ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی خاص مسئلہ کو اپنا موضوع بناتا ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ اس مسئلہ کا حل بھی مہیا کرے۔ ناولٹ میں مقصد یا نقطہ نظر کی افادیت تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

> ''ناولٹ کسی مخصوص فلسفہ حیات کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔ زندگی سے متعلق بغیر کسی واضح نقطہ نظر کے اس کا ڈھانچہ تیار نہیں ہو سکتا اور اگر تیار بھی ہو جائے تو یہ عمارت استوار نہیں ہو سکتی بلکہ وہ واقعات کے مدوجزر، کرداروں کے اقوال وافعال اور حرکات وسکنات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔''

(ناولٹ کی تکنیک، مشمولہ ''نقوش'' لاہور، ش ۱۹ و ش ۲۰، ص ۲۰۷)

ناولٹ نے اپنے ابتدائی دور سے آج تک تکنیک کے لحاظ سے کئی منزلیں طے کی ہیں اور تکنیک واظہار سے کئی اہم ناولٹ معرض وجود میں آچکے ہیں۔ آج جو ناول شائع ہو رہے ہیں، تکنیک واسلوب کے لحاظ سے وہ ناولٹ کے دائرے میں ہی آئیں گے، کیونکہ ناول کے لوازمات کو پیش کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ناول نگار ان فرائض کی ادائیگی سے بھاگ رہا ہے۔ اس کا سبب آج کا مشینی دور اور کمپیوٹرائزڈ زندگی بھی ہے۔ اب سماج میں کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ بیٹھ کر ساری کائنات کے مسئلوں اور گتھیوں کو سلجھائے۔ اسی ضرورت کے تحت افسانے وجود میں آئے چونکہ افسانے اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ کچھ لمحوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا قاری کو نہ ہی ذہنی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی پوری تشفی اور ان ضرورتوں کو ناولٹ سے پورا کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے الفاظ میں:

> ''ناولٹ ہی ایک سمجھوتے کی صورت پیش کرتی ہے۔''

(ادبی تخلیق اور ناول، ص ۱۳۷)

ناولٹ کا میدان ناول کی طرح وسیع نہیں ہوتا کہ اس میں پلاٹ در پلاٹ اور ذیلی پلاٹ برتا جائے۔ ناولٹ کا مزاج صرف سیدھا سادہ پلاٹ برداشت کر سکتا ہے۔ پیچیدہ پلاٹ ناولٹ کے لئے ضروری نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے پلاٹ سادہ ہونا چاہئے، بیشک:

> ''ناول کی طرح ناولٹ کا موضوع بھی انسانی زندگی ہی ہوتی ہے، لیکن اس انسانی زندگی سے وہ عموماً سادہ ہوتی ہے یعنی ناولٹ کا پلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتا اور افکار وواقعات اس میں نہیں سموئے جاتے ہیں۔''

ناولٹ کا ہیرو یا مرکزی کردار ایک طرح سے خاص ذریعہ ہے جو پوری

تخلیق میں رواں دواں نظر آتا ہے اور اپنی کرداریت، تشخص اور کارکردگی کے باعث ہی وہ سارے واقعات کا مرکزی لفظ بن جاتا ہے۔

ناولٹ کی ساری خوبی و دلکشی اس کے ارد گرد رہتی ہیں اور پوری کہانی کے سارے واقعات سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ کردار کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ کردار کی تشخیص اور عمل کی تعبیر کرتے وقت مصنف کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس کے کردار حساس، فطری اور آسان ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قاری کے ذہن و قلب کو متحیر کردیں۔

ناولٹ میں سارا زور مرکزی کردار پر صرف کرنا پڑتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے علاوہ جو کردار پیش کئے جاتے ہیں، وہ جامد ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کرداروں کا تعلق مرکزی کردار کی اہمیت اور افادیت کو بڑھانے کے ساتھ ہی ساتھ ان کا اپنا مقام بھی معین و مخصوص کرتا ہے۔ ناولٹ کے کرداروں کو نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی دکھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا کرنے سے ان کی سیرت و شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ کرداریت کی داخلی کشمکش اگر ان کے سماجی کاموں میں رکاوٹ بن کر نہیں آئے تو بلاشبہ ناولٹ اپنے دلکش تاثرات پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ناولٹ میں مکالمہ کی اپنی خاص اہمیت ہے، جس کے سہارے پلاٹ اور کرداروں کا ارتقا ہوتا ہے۔ مکالمہ نگاری کے لئے ناولٹ نگار کو ذہن و شعور کی گہرائیوں سے کام لینا پڑتا ہے اور فنی بصیرت اس کے لئے لازمی امر ہے۔ اگر ماحول کو سامنے رکھے بغیر صرف مکالمے سے کام لیا جائے تو تخلیق کے سارے پہلو ہم آہنگ نہ ہو پائیں گے اور ناولٹ اپنے فن پر پورا نہیں اتر سکتا۔

ناولٹ کی اولین شرائط میں شامل ہے کہ مکالمے برمحل ہوں، طویل اور بے جا باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ اگر ان چیزوں سے احتراز نہ کیا گیا تو ناولٹ کے مکالمے مجروح ہو کر بے جان ہو جائیں گے۔ ناولٹ نگار موثر اور واضح مفہوم دینے والی چیزیں پیش کرے اور رمز و اشارے کنائے کی مدد سے وہ اپنی زبان کو ترتیب دے، تب ہی ناولٹ کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر گھنشیام مدھوپ مکالمہ کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کہانی کے ارتقا اور کردار نگاری دونوں کو ظاہر کرنے میں ناولٹ کے مکالمے کافی اہم ہوتے ہیں چونکہ اس کا پلاٹ مختصر ہوتا ہے۔ تفصیل اور بیانیہ انداز تقریباً نہیں ہوتا۔'' (ہندی لگھو اپنیاس،ص۶۰)

مکالمے کی زبان کرداروں کے لحاظ سے ترتیب دی جانی چاہئے۔ ناولٹوں میں کردار شہری اور کلچرڈ طبقہ کا ہے تو اس کو اپنے ماحول کا مترجم ہونا چاہئے۔ اسی طرح کسان مزدور جو دیہات میں زندگی گزارتے ہیں اور اپنی مخصوص زبان میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کی زبان اسی طرح کی ہونی چاہئے۔ ناولٹ نگار کو اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے سبھی کرداروں کی اپنی زبان ہو۔

ناولٹ میں مکالمہ ایک ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ مقصد، اس لئے ناولٹ نگار کو مکالمہ پیش کرتے وقت واقعات، ماحول، حالات اور کرداروں کے مزاج پر گہری نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ اگر یہ تمام لوازم مدغم ہیں تو بلاشبہ ناولٹ کامیاب ہوگا۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناولٹ کے لئے مکالمہ بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ پلاٹ، کردار یا زبان۔

ناولٹ نگار زندگی کے کسی خاص مسئلہ کو ہمارے سامنے ایک مجسمہ کی شکل میں پیش کردیتا ہے۔ اس کا حل تلاش کرنا قاری کی ذمہ داری ہوتی ہے، لیکن اگر غور و خوض کیا جائے تو مصنف کا یہ عمل مقصد ہی میں شمار کیا جائے گا کہ وہ سماج اور زندگی کے کسی پیچیدہ اور عصری مسئلے کو ہمارے سامنے پیش کردے، لیکن اس کا حل یا تفصیل بیان کرنا اس کا کام نہیں۔ ناولٹ کا خاتمہ اس طرح ہونا چاہئے کہ قاری کچھ لمحہ کے لئے تفہیم اور تجسس میں مبتلا ہو جانے پر مجبور ہو۔ ناولٹ میں مقصد کی پیشکش ایسی ہونی چاہئے کہ وہ قاری کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کردے۔

ناولٹ نگار بہ حیثیت رہنما یا سماجی کارکن کام نہیں کرتا بلکہ وہ جس معاشرے میں زندگی گزارتا ہے، اسی سماج کے عصری زیر و بم کی عکاسی اور اس کے اہم اور مقدم مسئلے کی پیشکش ہی اس کا عین مقصد ہوتا ہے۔ ناولٹ نگار کا مشاہدہ وسیع بسیط، عمیق اور گہرائی کا حامل ہوتا ہے۔ وہ زندگی اور سماج کے تمام تغیرات، محرکات، تجربات و محسوسات سے خاصی واقفیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے جس فن کار کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوگی اس کی تخلیق میں پیش کردہ تجزیہ زندگی میں بلا کی گہرائی اور گیرائی نظر آئے گی۔

ناولٹ کا دائرہ چھوٹا ہوتا ہے، لہٰذا ناولٹ نگار کو غزل گو کی طرح ہونا چاہئے جو ایک شعر میں کبھی کبھی اتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے کہ اس کی تفسیر ضخیم کتابوں پر بھی بھاری ہو جاتی ہے۔ اس کا مصنف اپنی شخصیت کو کبھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ اس کے تجربات و محسوسات خود بخود باہر آجاتے ہیں۔ غرض کہ ناولٹ کسی ایک خواب کی تجسیم پیش کرتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں، جوئے شیر لانے کے مصداق ہے، کیونکہ پلاٹ کے مطابق ہی کرداروں کی تخلیق کرنا ہوتی ہے۔ کرداروں کی تعداد کم ضرور ہوتی ہے، لیکن ان کی شخصیت کو ابھارنے کے لئے کار آگہی اور توجہ درکار ہے۔ شخصیت پیدا کرنے کے لئے ناولٹ نگار کو ماہر نفسیات کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ دل و دماغ کے تموج کی تصویر پلاٹ میں فعالیت پیدا کرتی ہے اور کرداروں کو جاذب توجہ بناتی ہے۔ ناولٹ کے کردار بالخصوص ہیرو کو کبھی کبھی غیر معمولی بھی بنانا پڑتا ہے کیونکہ اس سے اس کی شخصیت کے خال و خط پوری طرح ابھر سکتے ہیں۔ اس کو خود سے کشمکش میں مبتلا کیا جا سکتا ہے اور اس کشمکش میں اس کی شخصیت نکھرتی ہوئی دکھائی جا سکتی ہے۔ ناولٹ کی کامیابی یا ناکامیابی کا دارو مدار کردار نگاری پر ہے۔

ناولٹ نگار جس دنیا کی تخلیق کرتا ہے وہ ہمارے محسوسات، محرکات، جذبات، مشاہدات اور مثبت نتائج کی دنیا ہوتی ہے۔ اپنے تہہ گیر مشاہدے کے ذریعہ وہ ایسے کردار اور ایسی صورت حالات کو متصور کرتا ہے، جس سے تھوڑی دیر کے لئے قاری یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ واقعات سے دوچار ہو رہا ہے۔ ناولٹ میں پیش کردہ تجزیہ زندگی کا بڑا تہہ گیر تجزیہ ہوتا ہے۔

ناولٹ نگار کی چشم مشاہدہ کسی ایک ہی افق پر مرکوز نہیں ہوتی اسے ہمارے محرکات و محسوسات کا ارتقائی علم رہتا ہے اور اس طرح وہ اپنے تجربات کا سیر حاصل نچوڑ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ ناولٹ نگار جس مقصد کو سامنے رکھ کر ناولٹ کی تعمیر کرتا ہے اس میں مواد اور اسلوب کی آمیزش کا فنی طریقہ اظہار ہی تکنیک کی کامیابی ہے۔

ہمارے ناولٹ نگاروں نے شعور کی رو، حوالہ جات اور Association of Ideas وغیرہ کی تکنیک کا برمحل تجربہ کیا ہے۔ بیانیہ اسلوب میں ناولٹ زیادہ لکھے گئے اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں، لیکن کچھ فنکاروں نے اس میدان میں کئی تجربے کر کے اس صنف ادب کو فروغ دیا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے ناول اور ناولٹ میں کوئی فرق نہیں۔ کم و بیش اسی طرح کے اسلوب میں ناولٹ بھی لکھے جا رہے ہیں۔ ناولٹ سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر پرتاپ نرائن لکھتے ہیں:

> ''ناولٹ میں اسٹائل کے وہ سبھی اجزا موجود ہیں جو کہ ناول میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ سوانحی، بیانیہ، خطوط کی شکل میں، منظوم، ٹکڑوں ٹکڑوں میں اور ان سب کو ملا کر ایک مجموعی اسلوب بھی رہا ہے۔ ان اسلوب میں سے مختلف ضخیم ناول کے میدان میں اب تک جتنے طرز کا استعمال کیا گیا ہے، ناولٹ میں بھی ان سبھی اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔'' (ہندی اپنیاس کلا، ص ۲۶)

ناولٹ کے اسٹائل کی تقلید اردو ناولٹ نگاروں نے مغربی ادب کے ناولٹ سے کی ہے گو کہ آج ان رائج اسلوب میں اردو کا اپنا الگ طریقۂ کار ہے جس کے سبب متعدد جدید تجربے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن اسالیب میں ناولٹ لکھے جا رہے ہیں ان میں بطور خاص بیانیہ اسلوب، نفسیاتی اسلوب، خطوطی اسلوب، ڈائری اسلوب، سوانحی اسلوب، علامتی اسلوب، اساطیری و دیگر اسالیب ہیں۔

ناولٹ دراصل ناول کی ہی ایک ایسی شکل ہے جو ماحول اور اس کی تفصیلات میں فرق پیدا کرتی ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ناولٹ میں بھی ناول ہی کی طرح کردار نگاری، پلاٹ، زبان و اسلوب اور عصری ماحول کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ناولٹ کے مستقبل اور امکانات پر غور کیا جائے تو یہ چیزیں خاص کر مددگار ثابت ہوں گی کہ ناولٹ میں بھی اسٹائل کے وہ سبھی اجزا موجود ہیں جو کہ ناول میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کی قدروں اور روایتوں کو ناولٹ اور ناول دونوں میں برابر طور سے اہمیت دی گئی ہے۔ ناولٹ میں بھی ناول نگار اپنی بات کو اتنی ہی گہرائی سنجیدگی اور اثر انداز ڈھنگ سے پیش کر سکتا ہے جتنا ناول میں۔ (ہندی اپنیاس کلا، ص ۲۶)

اردو میں ابھی اچھے ناولٹ کم لکھے گئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ناول نگاری کی کوئی مضبوط روایت

موجود نہیں، جب اچھے ناول ہی نہیں لکھے گئے ہیں تو پھر ناولٹ کی نازک تکنیک کو کس طرح برتا جاسکتا ہے۔ ناول نگاروں میں لے دے کر ایک پریم چند ہیں جنھوں نے بعض اچھے ناول لکھے ہیں، لیکن تکنیک کے اعتبار سے ان کے ناولوں کو بھی شاہکار نہیں کہا جاسکتا۔ پریم چند میں ناولٹ کی تکنیک کا شعور نہیں تھا، یہ شعور ہمارے یہاں ان کے بعد کے لکھنے والوں نے اپنے تجربوں سے روشن کیا ہے۔ سید سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات''، عصمت چغتائی کا ''ضدی'' اور عزیز احمد کا ''مرمر اور خون'' اور ''ہوس'' کسی حد تک اس تکنیک کے تحت شمار کئے جاسکتے ہیں۔

ناولٹ کے اسالیب سے متعلق جو باتیں مجموعی طور پر کہی جاسکتی ہیں وہ یہ کہ بیانیہ اسلوب ناولٹ کو کچھ زیادہ راس آیا۔ البتہ کچھ نئے تجربے ضرور ہوئے جو ناولٹ کی سادہ نگاری سے مختلف اور تجرباتی قسم کے ہیں۔ ناولٹ کے لئے تخلیقی زبان کا ہونا اولین شرط ہے۔ بہ الفاظ دیگر جس سماج میں ہم سانس لے رہے ہیں اسی معاشرے کی روزمرہ کی زبان ہونی چاہئے کیونکہ قواعد اور لغت سے مرصع زبان ناولٹ کا مزاج برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ کامیاب ناولٹ نگار اپنے مقصد اور فن کو بروئے کار لانے کے لئے اپنی زبان ہی استعمال کرتا ہے، لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ ناولٹ کی زبان سادہ بھی ہوتی ہے اور تخلیقی بھی۔ یعنی علامتی زبان میں بھی ناولٹ لکھے جاسکتے ہیں چونکہ زبان واقعہ یا قصہ بیان کرنے کا ذریعہ ہے، اصل مقصد نہیں۔

ناولٹ نگار کی زبان سادہ بھی ہوسکتی ہے، تخلیقی بھی اور علامتی بھی، اس لئے یہ پابندی عائد کرنا کہ ناولٹ کی زبان سادہ ہی ہونی چاہئے غلط ہے۔ ناولٹ نگار اپنے اظہار کے لئے جو بھی طریقہ اختیار کرتا ہے وہ مناسب ترین ہوتا ہے، لیکن اگر وہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو قصہ کو کمزور کرتی ہے یا کسی طرح ناولٹ کو کمزور بناتی ہے تو یہ اس کی خامی کہی جاسکتی ہے۔ اردو میں کامیاب ناولٹوں کی زبان ہمارے سماج میں بولی جانے والی زبان ہی ہے، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ناولٹ علامتی نہیں ہوسکتے یا علامتی زبان میں ناولٹ نہیں لکھے جاسکتے۔ تجربات کے لئے ادب کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ❁❁

فن کار کا اخلاقی اور تخلیقی فرض

جس طرح الفاظ اور ان کے پرانے معنوں کی وکالت مستحسن نہیں، اسی طرح عورتوں یا مردوں کے جسمانی اعضا کی وکالت اور کسی ایک ہی احساس یا تاثر کی رَٹ بھی غیر مفید ہے، بلکہ کبھی کبھی نقصاندہ۔ فن کار بھی تو انسان ہوکر ہی زندہ رہتا ہے۔ اس کی تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا عکس، اس کی تخلیق کے تمام مرحلوں میں اُبھرتا رہتا ہے۔ کوئی فنکار نہ ہو، انسان تو ہو ہی سکتا ہے، مگر انسان نہ ہوتے ہوئے بھی فن کار ہو اور اعلان کرے کہ میں محض فن کار ہوں تو پھر —— پھر ہم یہ سمجھیں گے کہ انسانی ضروریات سے اس بیچارے کا کوئی تعلق نہیں، اس کی کوئی تہذیبی تاریخ نہیں، اس کی کوئی معاشرتی وراثت نہیں، اس کا کوئی اخلاقی سرمایہ نہیں اور کیا یہ ممکن ہے؟ یوں عصری جبریتوں کے شکار سبھی ہوتے ہیں، لیکن موجودہ دور کی شاعری کے بعض گمراہ کن اور مریضانہ میلانات تو خود اس ماحول میں مہلک زہر سرایت کررہے ہیں جس میں ہم سب زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ فنکار بھی اپنی زندگی، نجی زندگی میں سماجی آداب و اقدار کا پابند ہوتا ہے۔ عام انسان سے چونکہ وہ الگ ہوتا ہے اس لئے اس پابندی میں بھی اسے آزادی حاصل ہوتی ہے اور یہ آزادی صرف فکری ہی ہوتی ہے کیوں کہ فن کار کی داخلی دنیا جب خارجی دنیا سے متصادم ہوتی ہے تو اس کے اندر کی سچائی اور بلندی باہر کے جھوٹ، تاریکی اور پستی کو حیرت، نفرت اور اضطراب سے دیکھتی ہے۔ فن کار کا بنیادی، اخلاقی اور تخلیقی فرض ہے کہ وہ کم از کم اپنے سامنے جھوٹا نہ بنے۔ اپنے محسوسات کو ایماندارانہ طور پر پیش کرے۔ اپنے اندرونی سچ سے بیرونی جھوٹ پر غلبہ نہ بھی پاسکے تو جھوٹ کو جھوٹ ضرور سمجھے، اس سے مرعوب نہ ہو۔ ذات کی فرضی ناآسودگی، مصنوعی تنہائی اور رسمی تشکیک کے منفی اظہارات کے ذریعہ خود کو محض فرد مظلوم و مجبور ثابت نہ کرے۔ (ماخوذ از مقالہ مشمولہ مضامین، قمر اعظم ہاشمی، ص ۱۵ و ص ۱۶)

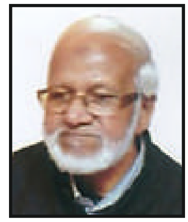

نذیراحمد یوسفی

"Urdu Darbar" Rahmania School Street, Jahangiri Mohalla
Asansol - 713302 (West Bengal)

مولانا اور مولانا کی چائے

مولانا ابوالکلام آزاد عالم دین، مفسر قرآن، منفرد انشا پرداز، بے مثال خطیب اور مدبر سیاست داں ہی نہیں نفیس ترین انسانی واخلاقی اقدار کی حامل ایک نمایاں ترین تہذیبی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ گفتگو کرتے تو آواز دھیمی ہوتی اور ٹھہر ٹھہر کر مطلب کی بات واضح کرتے کہ سننے والے پر اچھا تاثر ٹھہرتا۔ ان اوصاف کے علاوہ مولانا آزاد کی امتیازی شان یہ تھی کہ وہ علوم قدیمہ وجدیدہ کا حسین امتزاج بھی تھے اور مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے قومی رہنماؤں کے ہم پلہ اور مشیر کار بھی تھے۔

ان کے والد محترم مولانا خیرالدین ایک متقی، مکمل دیندار پیر تھے اور کثیر تعداد میں لوگ ان کے مرید تھے جو مولانا کو بھی ''چھوٹے حضرت'' کہا کرتے تھے۔ مولانا کو کم عمری سے ہی کتابوں کے مطالعہ کا شوق رہا تھا۔ لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود اور بھاگ دوڑ میں گزارتے ہیں، لیکن مولانا نے اپنی خوبصورت عادت کے بارے میں خود بتایا ہے کہ:

> ''میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ کے ڈلہوزی اسکوائر، جنرل پوسٹ آفس کے سامنے درختوں کی جھنڈ ہے، اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے، وہیں ایک بینچ بھی ہے۔ وہیں بیٹھتا اور مطالعہ کرتا۔ میری عادت تھی کہ کہیں نکلتا تو ایک کتاب ضرور ساتھ میں رہتی۔''

والد محترم مولانا خیرالدین صاحب بھی اپنے صاحبزادے کی اس عادت سے واقف تھے اور ان کے مطالعہ کے شوق سے انہیں تشویش لاحق رہتی تھی کہ کہیں وہ اپنی صحت نہ بگاڑ بیٹھیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی، تعلیمی، صحافتی اور ادبی ودینی مصروفیات اور ان کے متنوع کارناموں کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب بھی لکھا جا سکتا ہے۔ فی الوقت میں اس مضمون میں حسب عنوان مولانا کی چائے اور چائے کی فنجانی کے بارے میں مختلف اہل قلم کی رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے علامہ جمیل مظہری کا یہ بیان پڑھئے اور محسوس کیجئے کہ انہوں نے ملاقاتیوں سے مولانا کے برادرانہ سلوک کا ذکر کتنے دلچسپ انداز میں کیا ہے:

> ''مولانا سے رسمی ملاقاتیں ۱۹۳۴ء سے پہلے بھی ہوئیں، لیکن باضابطہ ملاقات (اُس موقع سے ہوئی جب) آل انڈیا اردو لٹریری کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مولانا کو کانفرنس کی دعوت دینے گیا اور رخصت ہوتے ہوئے مولانا سے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ اجازت دی اور کہا کہ بھئی! سنیچر کی شام کو آؤ، روزہ رکھتے ہو یا نہیں رکھتے ہو، لیکن میرے ساتھ افطار کرو، پھر مسکرا کر کہنے لگے۔ تم اتنے بدذوق تو نہیں ہو کہ اگر روزہ نہ رکھو تو افطار سے بھی پرہیز کرو۔ میں نے تسلیم کیا اور آئندہ حاضر ہونے کا ارادہ کر کے چلا آیا۔ تیسرے دن حاضر ہوا۔ مولانا کو اطلاع کروائی۔ مولانا نیچے اترے۔ ملازم کے ہاتھ میں افطار کا خوان تھا۔ افطار کے بعد چائے آئی تو مولانا نے خود اپنے ہاتھ سے چائے پیش کی۔ میں نے معذرت کی کیونکہ مجھے زکام تھا۔ میرے عذر پر مولانا گھبرا گئے اور دریافت کیا کہ آپ چائے نہیں پیتے؟ میں نے عرض کیا پیتا ہوں اور شوق سے پیتا ہوں، لیکن اس وقت زکام میں مبتلا ہوں۔ مولانا کے منھ سے بے اختیار الحمدللہ نکلا تو میں نے اس کی وجہ دریافت کی؟ تو بولے بھئی' جو لوگ چائے پینے سے پرہیز کرتے ہیں ان سے

ڈرنے لگا ہوں کہ چائے جیسی نعمت سے پرہیز کرنے والے بھی اس دنیا میں ہیں۔''

مولانا آزاد کی اسی چائے کے سلسلے سے ایک بات کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر نے بھی کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میری پہلی ملاقات ان سے ایک وفد کے ساتھ ہوئی تھی۔ وفد ان کے دولت کدے پر میں ہی لے گیا تھا۔ بات چیت کے بعد رخصت ہونے لگا تو مولانا نے روک لیا۔ سب تو چلے گئے، تو مجھے اپنے نزدیک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں از راہ اداب واحترام ذراہٹ کر بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن ان کے اصرار پر ان کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں خادم نے چائے کی ٹرے لاکر رکھ دی۔ میں چائے سے نفرت کرتا ہوں اور شاید یہ بات مبالغہ نظر آئے، لیکن میں نے اپنی ساری زندگی میں چار پانچ دفعہ ہی چائے چکھی ہوگی۔ اب میرے لئے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہوگئی تھی۔ مولانا کی عظمت واحترام کا اثر تھا کہ میں نے چپ کے سے چائے کی پیالی لے لی اور چائے کے ایک دو گھونٹ احتراماً پی بھی لئے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ مولانا چائے کے رَسیا ہیں اور خود چائے تیار کرنے میں بھی ماہر ہیں۔''

مولانا کی مرغوب چائے یعنی بقول مولانا ''گوری چنبیلی'' کا تذکرہ ایک بار پھر راحت علی خان کے قلم کی روانی میں بھی ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے ایک خط مولانا کو روانہ کیا اور ان کی پسند کی چائے کے بارے میں لکھتے ہوئے عرض کیا کہ آپ کی چائے نہ دیکھی اور نہ چکھی، لیکن غائبانہ عشق ضرور ہو گیا ہے۔ مولانا نے جواب میں لکھا: عزیزی! مجھے خوشی ہوئی کہ میری اس ڈھینچوں ڈھینچوں چائے کا کوئی قدردان تو ملا، افسوس کہ میرے پاس اس کا تلچھٹ بھی نہیں، بہرحال جب بھی نیا ڈبہ آیا، آپ کو ضرور بھیجوں گا۔''

راحت علی خان نے تقریباً سات یا آٹھ سال بعد سن ۱۹۵۷ء میں مولانا سے ان کے دولت کدے پر ملاقات کی۔ اپنے اس خط کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا تو مولانا نے سرسری نظر راحت علی خان کی طرف ڈالی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے، عبداللہ ملازم کو چائے لانے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر میں مخصوص چینی چائے آئی اور فنجانوں میں انڈیلی گئی تو ایک فنجان راحت علی خان کے حصے میں بھی آیا اور انہوں نے بڑے شوق بھرے انداز میں اس خوددار چائے کا ایک گھونٹ اپنے حلق سے اتارا، جس نے شکر اور دودھ کا کوئی لگاؤ بھی گوارا نہیں کیا تھا، لیکن اس چائے کا لطف پہلے اور دوسرے گھونٹ میں نہیں ملا۔ چائے کے اور دو چار گھونٹ حلق میں اتارے تو عجیب وغریب کیف وسرور حاصل ہوتا گیا اور فنجان خالی ہوگیا۔ اس طرح راحت علی خان کی چائے سے غائبانہ عشق کا قصہ، ہر ملاقات میں مولانا نے اتنا پختہ کردیا کہ وہ نہ صرف مولانا کو بلکہ ان کی چائے کو یعنی 'گوری چنبیلی' کو تا حیات فراموش نہ کر سکے۔

مولانا خوراک کے معاملہ میں بھی بے حد سادگی پسند تھے۔ ہلکی پھلکی غذا کو ہی اہمیت دیتے تھے۔ مرغوب غذا میں دوہری روٹی اور آلو پالک کی بھجیا تھی۔ چائے تو عجیب وغریب تھی ہی۔ مولانا نے اپنی پسندیدہ چائے کی تفصیل یوں لکھی ہے:

''میں ہمیشہ صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھ جاتا ہوں اور چائے کے فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں، آپ کو یہ بھی بتادوں کہ چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے قدرے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجئے گا تو دو گھونٹ میں ختم ہوجائیں، مگر میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا۔ میں جرعہ جرعہ، ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا، پھر جب پہلا فنجان ختم ہوجائے گا تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤں گا، پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود وزیاں کو یک قلم فراموش کردوں گا۔''

(درسی کتب ورسائل اور مطبوعہ مضامین سے براہ راست استفادہ)

❁❁❁

ڈاکٹر احسان عالم
Near Al-Hira Public School, Moh: Raham Khan, P.O. Lalbagh, Darbhanga - 846004

قمر اعظم ہاشمی: اردو تحریک کا نمایاں نام

پروفیسر قمر اعظم ۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء کو باقر گنج محلّہ لہریا سرائے، دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن موضع ٹکولی، رونی سید پور، ضلع مظفر پور تھا۔ ان کے والد محترم ڈاکٹر اعظم ہاشمی تھے جو ہومیو پیتھک کے ایک اچھے ڈاکٹر تھے، ساتھ ساتھ مجاہد جنگ آزادی بھی تھے۔ جنگ آزادی کے دوران ڈاکٹر اعظم ہاشمی نے کئی دفعہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ قمر اعظم ہاشمی کی عمر صرف پانچ سال تھی تب ان کی والدہ محترمہ قمر النساء کا انتقال ہو گیا۔

قمر اعظم ہاشمی کی ابتدائی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں مدرسہ احمدیہ سلفیہ، لہریا سرائے دربھنگہ میں داخل کرائے گئے، پھر ۱۹۵۲ء میں شفیع مسلم ہائی اسکول میں داخلہ ہوا جہاں سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ملت کالج دربھنگہ سے آئی۔ اے اور بی۔ اے (اردو آنرز) کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے پٹنہ یونیورسٹی گئے۔ ۱۹۶۳ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ ان کے ہم جماعتوں میں پروفیسر لطف الرحمٰن، ظفر اوگانوی، غنی صدیقی، علی حیدر ملک، علیم اللہ حالیؔ، شرف الدین ملک، عظیم الدین شاکر اور عصمت آرا وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

قمر اعظم ہاشمی نے ۱۹۷۰ء میں لکچرر کی حیثیت سے شعبۂ اردو، ایل۔ ایس۔ کالج مظفر پور جوائن کیا۔ یہیں صدر شعبۂ اردو، ریڈر اور یونیورسٹی پروفیسر ہوئے اور ۳۰ نومبر ۲۰۰۲ء کو یہیں سے سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی ادبی زندگی کا آغاز بی۔ اے کی تعلیم کے زمانہ میں ہی ہو چکا تھا۔ گریجویشن کی مدت میں تقریباً دوسو افسانے لکھ چکے تھے۔ وہ منٹو سے زیادہ متاثر تھے اور نفسیات سے گہرا شغف تھا جس کی بنا پر وہ زیادہ تر نفسیاتی کہانیاں لکھتے تھے۔ ان کی مقالہ نگاری میں بھی نفسیاتی انداز جھلکتا تھا۔ قمر اعظم ہاشمی اس زمانہ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''میری تنقید نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے افسانے لکھ رہا تھا۔ سی۔ ایم۔ کالج دربھنگہ کے افسانوی مقابلے میں مجھے سبقت بھی ملی تھی۔ میں نے تمام افسانوں کو تلف کر دیا اور تنقید نگاری پر توجہ دینے لگا۔ کئی مضامین شائع بھی ہو چکے تھے۔ لطف الرحمٰن غزل نگاری کی طرف راغب تھے اور شبیر احمد افسانے لکھ رہے تھے، میں انٹر ہی میں تھا کہ اختر اورینوی کی کتاب 'بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا' اور کلیم الدین احمد کی کتاب 'اردو شاعری پر ایک نظر' پڑھ چکا تھا۔'' (سرسری اس جہان سے گزرے، ص ۱۶ و ص ۱۷)

قمر اعظم ہاشمی کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ادیبوں اور ناقدوں نے اپنے تاثرات کا اظہار منفرد لہجے میں کیا ہے، یہاں چند اہم مشاہیر ادب کی آرا قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں:

پروفیسر شکیل الرحمن:

''مجھے یاد نہیں قمر اعظم ہاشمی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ کوئی دن تو ہوگا، وہ بے نام دن میرے لیے اس واسطے اہم ہے کہ مجھے قمر اعظم ہاشمی ملے تھے۔ دنیا میں قمر اعظم ہاشمی اتنے کم ہیں کہ جب وہ ملے تو میں نے فوراً انہیں دل و جان سے قبول کر لیا۔''

(زبان وادب، پٹنہ گوشۂ قمر اعظم ہاشمی، ص ۳۱)

پروفیسر نجم الهدیٰ:

''قمر اعظم ہاشمی ایک جان بے تاب کے پیکر اظہار کا نام ہے۔ ہمیشہ کچھ کہتے رہنا اور اظہار ذات کے نت نئے پہلو کی تلاش ان کا مرغوب مشغلہ ہے۔ کوئی اگر پوچھے

کے سعی مسلسل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے تو معاصر شخصیتوں کے تناظر میں اس کا جواب صرف قمر اعظم ہاشمی ہوگا۔''

پروفیسر ثوبان فاروقی:

''ڈاکٹر قمر اعظمی ہاشمی کی رحلت ایک ایسا ادبی سانحہ ہے جس کی تلافی کا امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ وہ تاعمر اردو کے لیے سرگرم عمل رہے۔ انہیں اردو کے کلاسیکی، جدید اور مابعد جدید ادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔''

(سہ ماہی ''اصناف ادب''، مظفر پور، قمر اعظم ہاشمی نمبر، ص ۴۷)

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

''قمر اعظم ہاشمی کی ادبی شخصیت کا ایک نمایاں پہلوان کی تنقید نگاری ہے۔ انہوں نے ادبی موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جن میں ان کی ناقدانہ صلاحیت اور بہترین ادبی شعور کا اظہار ہوا۔ قمر اعظم ہاشمی کی تنقید میں روایت کا احترام اور جدید تبدیلیوں کا استقبال پایا جاتا ہے۔'' (زبان وادب، پٹنہ، گوشۂ قمر اعظم ہاشمی، ص ۴۶)

پروفیسر منظر اعجاز:

''ہاشمی صاحب اپنی ذات میں ہی ایک وقیع شعبۂ اردو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی رہائش گاہ کے وسیع ہال کو بھی ایک جامعہ یا مدرسہ کی نوعیت دے رکھی تھی۔ اسی ہال کے ایک گوشے کو انہوں نے لائبریری بنا رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے دونوں پہلوؤں سے ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہا۔''

(''تاثرات اور تجزیے''، مصنفہ: ڈاکٹر منظر اعجاز، ص ۱۰۱)

پروفیسر سید حسن عباس:

''استاد محترم پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی شخصیت ایسے کمالات وصفات کا مجموعہ ہے جس کے بارے میں کسی ایک مجلس میں اظہار خیال ممکن نہیں۔ وہ علم وادب کا ایسا مینار ہیں جس کی بلندی پر ہمیں فخر ہے۔'' (پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ مرتبہ: ڈاکٹر ولی احمد ولی، ص ۱۱۶)

مضمون کی مناسبت سے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی اردو تحریک سے وابستگی کا تذکرہ مقصود ہے، لہٰذا اب میں اپنے موضوع پر آتا ہوں۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو اردو سے والہانہ محبت تھی۔ وہ نہ صرف اردو زبان وادب کے معروف استاد اور نامور ادیب، ناقد اور محقق تھے بلکہ بہار کی اردو تحریک کے مضبوط سپہ سالار بھی تھے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی تحریک میں ان کا رول نمایاں رہا ہے۔ اس تحریک کو انہوں نے جس خلوص، محنت اور انہماک سے مضبوطی بخشی وہ بہار کی اردو تحریک کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اردو تحریک کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر عبدالمغنی نے ۱۱ستمبر ۲۰۰۵ء کو پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی لسانی، صحافتی، تدریسی، علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں منعقدہ سیمینار (بمقام عابدہ ہائی اسکول، مظفر پور) کے موقع پر اپنے خطبہ استقبالیہ میں کہا تھا:

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا تعاون اردو تحریک کو اس طرح حاصل ہوا کہ وہ تعاون حاصل نہیں ہوتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تحریک کامیاب ہوسکتی تھی یا نہیں۔ اردو کے استاد تو بہت تھے، آج بھی ہیں، لیکن اردو تحریک سے تعلق رکھنا اور اس کی مشکلات کو برداشت کرنا اردو کے ہر استاد کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے جان جوکھم کا کام ہے۔ اردو تحریک کے ساتھ کامیاب تعاون اردو کے استادوں نے، شاگردوں نے، دوستوں نے بھی کیا اور اس تعاون کے فراہم کرنے میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا حصہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے ہر استاد سے بڑھ کر ہے۔'' (پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت، ص ۴۷)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے دوران طالب علمی سے ہی تنظیمی وتحریکی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ دلچسپی ان کے مزاج اور ان کی فکر سے ہم آہنگ تھی۔ وہ جس تنظیم وتحریک سے منسلک ہوجاتے پھر اس کے علمبردار اور روح رواں ہوجاتے۔ ان کی اس خصوصیت کے پیش نظر ہی پروفیسر نجم الہدیٰ کی یہ رائے تھی کہ:

''تنظیم وتحریک ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کے خمیر کا حصہ ہیں۔''

قمر اعظم ہاشمی انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہونے کے بعد اردو تحریک میں جی جان سے جٹ گئے، حالانکہ اس وقت انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا قوم دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا تھا،لیکن انہوں نے کسی خطرہ کی پروا کیے بغیر خود کو انجمن کے لیے وقف کر دیا۔

۱۹۷۰ء میں اردو فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی تقرری ایل۔ایس کالج مظفر پور (بہار یونیورسٹی) میں ہوگئی۔ پٹنہ میں رہنے کے زمانے میں موصوف جناب غلام سرور، شاہ مشتاق احمد، بیتاب صدیقی اور پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت میں اردو تحریک کی مہم میں شریک تھے۔مظفر پور میں قیادت کی ذمہ داری انہوں نے خود اپنے کاندھوں پر لی۔ یہاں انہوں نے اپنے طلبا اور احباب کی مدد سے انجمن ترقی اردو کی مہم اور اس کی رکن سازی کا کام پورے علاقے میں پھیلانے کی پرزور جدوجہد شروع کی۔ گرچہ اس مہم میں انہیں یہاں مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا،مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔انہوں نے مظفر پور ضلع میں اردو تحریک کو اس قدر منظّم اور مضبوط کیا کہ یہ تحریک پورے شمالی بہار میں پھیلنے لگی اور اسے وسعت ملنے لگی،جس کی دھمک راجدھانی سمیت ریاست بھر میں محسوس کی گئی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو مظفر پور میں انجمن کو مضبوط کرنے کا ایک موقع اس وقت ہاتھ آیا جب انہیں ۱۹۷۲ء میں یہاں کے مشہور ادبی ادارہ ’’بزم فیض‘‘ کی ادبی نشست میں شرکت کا موقع ملا۔اس نشست میں کئی ادیبوں، شاعروں اور اردو دوستوں سے ان کی ملاقات ہوئی، جن سے انہوں نے اردو کے مسائل پر گفتگو کی۔نقی احمد جو بزم کے روح رواں تھے،ان کے علاوہ جمیل احمد ایڈوکیٹ، احترام الیقین ،مشتاق احمد انجم اور احمد تنویر جیسے کئی اردو دوستوں اور اردو نوازوں نے اردو زبان کی حق تلفیوں کو محسوس کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو کی تحریک کو تعاون دینے کا وعدہ کیا اور اس تحریک سے وابستہ ہوگئے ۔ جناب غلام سرور کی ایما پر عبدالقیوم لعل گنجوی نے قمر اعظم ہاشمی سے ملاقات کی اور اردو تحریک کو آگے بڑھانے کی کوششوں میں اپنے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا۔قمر اعظم ہاشمی نے تحریک کو مضبوط کرنے کے مقصد سے اپنی رہائش گاہ پر ایک مشاورتی میٹنگ منعقد کی جس میں جمیل احمد ایڈوکیٹ،عبدالقیوم لعل گنجوی،احترام الیقین، رفیق نور، احمد حسن ،نور عالم خاں، مظاہر حسین شمشاد اور کئی دوسرے لوگوں نے شرکت کی اور میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ اپنی مادری زبان اردو کے جائز اور منصفانہ حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد تیز کی جائے۔تحریک اردو سے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو جوڑا جائے، جلسے کیے جائیں اور اردو آبادی کو مادری زبان کی اہمیت بتلائی جائے اور عوامی مظاہرے کے لیے بھی فضا ہموار کی جائے۔

۱۹۷۲ء میں عوام کو اردو کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے ’’ادبی مرکز‘‘ کا قیام عمل میں آیا جس کی نشستیں ہاشمی صاحب کے مکان پر ہونے لگیں۔ان سرگرمیوں نے انجمن ترقی اردو کے پیغام کو شمالی بہار کے دور دراز علاقوں تک پہنچانے کا کام کیا۔اسی دوران قمر اعظم ہاشمی نے ’’بزم فیض‘‘ کے سکریٹری نقی احمد صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ بزم فیض کے زیر اہتمام ’’کل بہار ادبی انجمن کانفرنس‘‘ منعقد کی جائے اور اس موقع پر ایک بڑا مشاعرہ بھی منعقد ہو، تاکہ اردو آبادی میں بیداری لائی جائے۔ جناب نقی احمد نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے رابطہ کی تمام تر ذمہ داری قمر اعظم ہاشمی کے سر ڈال دی۔ ہاشمی صاحب نے نقی احمد کی پیش رفت اور جمیل احمد ایڈوکیٹ کے تعاون سے اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی پوری کوشش کی ۔کانفرنس حسب پروگرام منعقد ہوئی جس میں کئی اہم تجاویز منظور کی گئی۔ یہ تجاویز مشاعرہ سے پہلے سنائی گئیں۔مجلس میں موجود عوام نے اس کی تائید کی ۔اس کانفرنس میں پروفیسر عطا کاکوی، سہیل عظیم آبادی، مظہر امام، شکیب ایاز، سلطان اختر، احمد تبسم، ظہیر صدیقی اور دوسری کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ شمالی بہار میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کانفرنس تھی۔مقامی سطح پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے جس کے نتیجے میں اردو آبادی میں بیداری آئی۔

قصہ مختصر، اس کے بعد اردو کے ساتھ مسلسل ناانصافیوں کے حال واحوال دیکھتے ہوئے، بالآخر ۱۹۷۳ء میں احتجاج کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ جس کی شروعات مظفر پور سے ہوئی۔اس تحریک کی تفصیل پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنی تحریر ’’انجمن کی ان کہی باتیں‘‘ میں اس طرح لکھی ہے:

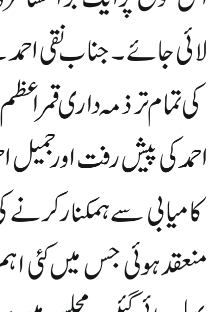

''جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کی تحریک پر میں نے یہاں اردو دوستوں کا ایک مؤثر حلقہ تیار کرلیا تھا۔ اردو کے لیے سڑکوں پر آنے کا معاملہ تھا۔ جلوس اور جلسے کی تاریخ کا اعلان ہوا اور میں پوری مضبوطی اور دلجمعی سے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں مصروف ہوگیا۔ پروفیسر اخترؔ قادری مرحوم میری سرگرمیوں سے پریشان بھی تھے اور خائف بھی۔ میں نے مرحوم پروفیسر قادری صاحب سے گفتگو کے دوران یہ کہا کہ میں مادری زبان کے حقوق کے حصول کے لیے سرگرم ہوں، یہ کوئی 'اینٹی نیشنل' رجحان تو نہیں ہے، مگر سچ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے وقت کی آبادی اردو کا نام لینے سے گھبراتی اور ڈرتی تھی۔ بہر حال میں اپنی کوششوں میں لگا رہا۔ مرحوم عبدالقیوم لعل گنجوی، نور عالم خاں، احمد حسن، جمیل احمد ایڈوکیٹ، اصغر اعجازی ایڈوکیٹ سرگرم معاون رہے۔ ٹاؤن ہال سے جلوس نکلا اور شاہراہوں سے ہوتا ہوا ضلع مجسٹریٹ کے دفتر کے پاس ختم ہوا۔ 'اردو کا حق دو'، 'اردو ہندی بہنیں ہیں'، 'بہنوں میں سنگھرش نہیں' جیسے نعرے لگائے جاتے رہے، جناب غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی، سید شاہ مشتاق احمد، جناب بیتابؔ صدیقی وغیرہ پٹنہ سے تشریف لائے تھے اور جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ کو میمورینڈم دیا گیا اور پھر تلک میدان میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔'' (سہ ماہی 'تمثیل نو'، دربھنگہ، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء، ص: ۴۵ و ص ۴۶)

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ اس مظاہرہ کی کامیابی سے اردو تحریک کو تقویت ملی اور قائدین اردو کے حوصلے بڑھ گئے، جس کے نتیجے میں انجمن کی سرگرمیاں کافی تیز ہوگئیں۔ ۱۹۷۴ء کے اوائل میں مظفر پور کے اراکین انجمن کی ایک اہم میٹنگ قمر اعظم ہاشمی کی قیام گاہ پر ہوئی۔ جس میں گزشتہ کارکردگیوں کا جائزہ لینے کے بعد اتفاق رائے سے یہ فیصلہ لیا گیا کہ مظفر پور میں ''کل بہار اردو کانفرنس'' منعقد کی جائے۔ یہ تجویز لے کر قمر اعظم صاحب پٹنہ پہنچے۔ وہاں انہوں نے اس سلسلہ میں مولانا بیتابؔ صدیقی، جناب غلام سرور، سید شاہ مشتاق احمد اور پروفیسر عبدالمغنی سے مشورے کیے۔ تمام قائدین نے کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی تائید کی۔ مولانا بیتابؔ صدیقی نے یہ تجویز ریاستی انجمن کی مجلس عاملہ میں پیش کی جو منظور کرلی گئی۔

حقوق اردو کے حصول کی تحریک سے لے کر قانون اردو کے نفاذ تک ہر مرحلے میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے نمایاں اور سرگرم حصہ لیا

اصلاح اور کلام اکبر کی نوعیت

اصلاح ایک بہت ہی مقبول اور عام فہم اصطلاح ہے۔ ناپسندیدہ اور غیر مستحسن اخلاقی اور معاشرتی روایات میں خوشگوار تغیر برپا کرنے کی آرزومندی ہی مصلحانہ شعور کی نشاندہی کرتی رہی ہے۔ اصلاح گویا معیاری، مفید اور صالح روایاتِ زندگی کی جستجو اور پرورش کا نام ہے۔ یہ فرسودگی اور تعطل سے لڑتی ہے، منجمد معاشرے میں زندگی کی گرمی اور سرگرمی پیدا کرتی ہے اور نئے امکانات اور تصورات کو سامنے لاتی ہے۔ گویا اصلاح کے شعور وجذبے کے پس منظر میں عصری صداقتوں کی کارفرمائی، محرکانہ نوعیت رکھتی ہے۔ جب تک کوئی شخص اپنے عہد کے حالات سے غیر مطمئن نہ ہو، پریشان نہ ہو، مضطرب نہ ہو، اُس وقت تک تبدیلی وتغیر کی خواہش اس کے اندر موجزن نہیں ہوسکتی۔ یہی خواہش دراصل اصلاحی احساس وفکر کی نشوونما کرتی ہے اور اپنے عہد کے حالات سے غیر مطمئن شخص کو بہتر اور محفوظ ومطمئن مستقبل کی دریافت پر مائل کرتی ہے۔ اصلاح کے اس مفہوم کا اطلاق اکبرالہ آبادی کی شاعری پر نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ تغیر کے ہرگز خواہاں نہ تھے۔ وہ تو اپنے عہد کے تغیر سے خائف تھے۔ محفوظ ومطمئن مستقبل کے وہ جویائی نہ تھے، روایات ماضی کی خستہ حال دیواروں سے چمٹے رہنے ہی میں سکون وعافیت دیکھتے تھے، وہ کسی نئی صورت حال کے متمنی نہ تھے، قانع حالات تھے۔ یعنی یہ کہ اکبر کو نہ بہتر مستقبل کی تلاش تھی، نہ اصلاح معاشرہ کی فکر، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں معاشرتی اصلاح کا پہلوان کی شاعری میں دریافت کرنا، میرؔ کی شاعری میں ظریفانہ پہلو دریافت کرنے کی

اور ہمیشہ ایک مجاہد کے رول میں رہے۔۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۰ء تک بہار کی اردو تحریک کی تمام سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ تحریک اردو کی تاریخ کا ہر صفحہ ان کی خدمات اور قربانیوں کا گواہ ہے۔ اپنی نمایاں خدمات کے باوجود انہوں نے اس پلیٹ فارم کو کبھی بھی اپنی شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کبھی کسی عہدے کی چاہت نہیں کی اور ہمیشہ ایک بے لوث اور مخلص خادم کی طرح ہی تنظیم سے منسلک رہے۔ انہوں نے عہدے کی خاطر نہ کبھی کسی باغیانہ سرگرمیوں میں حصہ لیا، نہ عہدہ پانے کے لیے کوئی جوڑ توڑ کی اور نہ اپنے قائد کے ساتھ کبھی کوئی بے وفائی کی۔ وہ ہمیشہ انجمن کے ایک وفادار سپاہی بن کر تنظیم کے لیے وقف رہے۔ انجمن سے چالیس سال کی وابستگی کے باوجود موصوف صوبائی سطح پر یہاں تک کہ ضلعی سطح پر بھی کسی اہم عہدہ پر فائز نہیں رہے، لیکن اپنی خدمات سے انجمن کو فیض پہنچاتے رہے۔ پروفیسر ہاشمی کی اس بے غرضی، بے لوث خدمت اور ایثار پسندی کے تعلق سے ڈاکٹر منظر اعجاز لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اردو کے بے لوث خادم، مرد مجاہد اور بہار میں اردو تحریک کے روح رواں تھے، لیکن بادشاہ گر کی طرح وہ اس تحریک و تنظیم کے محض ممبر ہی رہے۔ کبھی نہ نام ونمود کے خواستگار ہوئے، نہ کسی پندار انا کے شکار رہے۔ درد ملت اور غم اردو کو جس سلیقے سے انہوں نے اپنے دل میں جگہ دی وہ انہیں کا کام تھا۔''

(سہ ماہی ''اصناف ادب''، مظفر پور، قمر اعظم ہاشمی نمبر، ص ۴۹)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی عہدے اور منصب کو جھٹکتے رہے، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ۱۹۹۶ء میں منعقدہ انجمن کے صوبائی انتخاب کے موقع پر انجمن کی مجلس عاملہ کے کچھ اراکین نے جنرل سکریٹری کے عہدہ کے لیے قمر اعظم ہاشمی کا جب نام پیش کیا تو بیشتر کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس عہدہ کی ذمہ داری سنبھالیں، لیکن موصوف کو جیسے ہی اس کی خبر ملی کہ سید رضی حیدر (ایڈیٹر روزنامہ صدائے عام، پٹنہ) بھی اس عہدہ کے امیدوار ہیں تو فوراً اپنا نام واپس لے لیا۔ مجلس عاملہ کی اس تشکیل میں قمر اعظم ہاشمی بحیثیت رکن عاملہ نامزد کیے گئے اور وہ اسی میں خوش تھے۔

قمر اعظم ہاشمی کو پہلی دفعہ ۲۰۰۶ء میں انجمن ترقی اردو مظفر پور کے صدر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ زمانہ ان کی سخت علالت کا تھا۔ ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور وہ عمر کے اس منزل میں بھی پہنچ چکے تھے جہاں ان سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتی تھیں، لیکن اردو اور تنظیم کی محبت میں انہوں نے یہ عہدہ صرف اس لیے قبول کرلیا کہ اردو کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھنے والوں کا اس وقت مظفر پور میں فقدان ہو چکا تھا۔ انجمن کی ضلعی شاخ مظفر پور کو ایک بار پھر متحرک اور فعال بنانے کی کوشش شروع کی، لیکن ان کی مسلسل علالت نے انہیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔

۶/اپریل ۲۰۱۲ء کو قمر اعظم ہاشمی جیسی متحرک اور فعال شخصیت مالک حقیقی سے جا ملی واقعی ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❁❁❁

مہم کے مترادف ہے...... (کیونکہ) جو شخص کسی طرح کے تغیر سے پریشان اور انقلاب سے بیزار نہ ہو، وہ اصلاح معاشرہ کی فکر کر ہی نہیں سکتا...... حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی اصلاحی تحریک نے اردو شاعری اور ادب پر جو اثرات قائم کئے اس کی ایک منفی مثال اکبر کی شاعری ہے۔ اکبر کی شاعری کا بنیادی موضوع اصلاحی تحریک کی مخالفت ہے، چنانچہ اکبر اور سرسید دونوں ہی کو مصلح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مصلح یا تو سرسید تھے یا اکبر رہے ہوں گے۔ دونوں کے انداز فکر اور طرز فکر کا تضاد واضح ہے، سرسید کی اصلاح پسندی بالائے شک ہے اور اکبر کی شاعری سے ثابت ہے کہ وہ سرسید کے کٹر نکتہ چیں اور اصلاح پسندی کے میلان کے سخت مخالف تھے۔ روشن خیالی اور اصلاح پسندی کے برعکس اکبر کو روایتی مسلمانی ہی عمر بھر عزیز رہی جس کی شکست نے انہیں رنج وملال میں مبتلا رکھا۔

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ — مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

ایسی صورت میں اکبر کی شاعری میں معاشرے کی اصلاح کا پہلو دریافت کرنا ایک زحمت بے جا ہی تو ہے۔

(مقالہ ''کلام اکبر اور اصلاح معاشرہ''، مشمولہ ''مضامین''، قمر اعظم ہاشمی، ۱۹۹۸ء، ص ۷۶ تا ص ۸۳)

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی
At+P.o. Ijra, Via Rayam Factory, Dist. Madhubani - 847237 (Mob. 8651708079)

پروفیسر وہاب اشرفی کی تنقید نگاری

مابعد جدید تنقید کے علم بردار اور تحریک ساز ناقد پروفیسر وہاب اشرفی ناقد بھی تھے اور محقق بھی، ان کا ادب سے بھی رشتہ تھا اور صحافت سے بھی، انھوں نے فکشن یعنی افسانہ نگاری سے بھی اپنا رشتہ جوڑا، مگر ادب گلوب پر ان کی شناخت ایک ناقد کے طور پر قائم و مستحکم تھی اور وہ اسی حیثیت سے تنقیدی اور ادبی حلقوں میں زیادہ جانے گئے۔

وہاب اشرفی اکیسویں صدی کا ایسا معتبر تنقیدی نام ہے، جس نے اردو تنقید کو اپنی بنیادوں سے وابستہ کرنے کے ساتھ ساتھ، اس زبان کو دوسرے پوشیدہ علوم و معارف کے خزائن سے بھی متعارف کرایا۔ وہ جدید ذہن کے حامل ناقد و ادیب تھے، وہ قصہ قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کی تفریق کے روادار نہ تھے، بلکہ وہ ادبی تنقید میں آفاقیت و عالمگیری کے علم بردار تھے۔ ان کی نظر میں تنقید رائے زنی کا نام نہیں تھا کہ ہرا یرا غیرا شخص اپنے آپ کو تنقید نگار اور نقاد کہلانے لگے، بلکہ تنقید نکتہ رسی اور نکتہ شناسی کا نام تھا، جس کے لیے پِتہ ماری کرنی پڑتی ہے۔

وہاب اشرفی عالمی سطح کے نقاد تھے اور مقامی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ عالمی ادبیات پر بھی گہری تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ ''قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ''، ''قدیم ادبی تنقید''، ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری''، ''مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ''، ''آ گہی کا منظر نامہ''، ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''معنی سے مصافحہ''، ''مغربی و مشرقی شعریات''، ''حرف حرف آشنا'' اور ''معنی کی تلاش'' وغیرہ ان کے اہم تنقیدی دستخط ہیں۔

وہاب اشرفی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق تھے، ان کے اندر قلم کاری کے اوصاف و خصائص ابتدائے عہد سے موجود تھے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے زیادہ طویل انتظار نہیں کیا اور عہد طالب علمی سے ہی لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا، پہلے افسانے لکھے اور پھر ادبی تنقید کی طرف مائل ہوئے، ان کا پہلا تنقیدی مضمون وحشتؔ کلکتوی پر اسلامیہ کالج میگزین میں چھپا تھا، جب وہ یونیورسٹی کے ایک نوخیز طالب علم تھے، حالاں کہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری''، تحقیق و تنقید دونوں کا آمیختہ ہے، جس کو اس وقت کے نامور محقق قاضی عبدالودود نے بھی سراہا تھا، مگر ان کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب ''قطب مشتری: ایک تنقیدی جائزہ'' تھی، جس پر اس وقت کے نامور ناقد پروفیسر اخترؔ قادری نے پیش لفظ لکھا تھا اور ان کی اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھا تھا۔ یہ کتاب ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی، یہاں تک کہ دس برس کے بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی جزوی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوا۔

ناقد کا بہر حال اپنا تنقیدی نظریہ اور رویہ ہوتا ہے، جس پر وہ اپنے مستقبل کی راہ ہموار کرتا ہے اور اس حوالے سے دنیائے نقد و ادب میں مشہور ہوتا ہے اور مخصوص حلقے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہاب اشرفی کا تنقیدی موقف و منہج کیا ہے۔ اس سوال کے اشارے تو ہمیں ان کی پہلی تنقیدی کتاب میں ہی ملتے ہیں، مگر ان کی باقاعدہ وضاحت کے لیے ان کی مشہور زمانہ کتاب ''معنی کی تلاش'' کے اس طویل اقتباس کا سہارا لینا پڑتا ہے:

> ''میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے، ورنہ مقامی روایات کی زنجیر میں جکڑا ہوا پس ماندہ ادب اسے ہمیشہ عظیم نظر آئے گا اور پھر اس کی رائے اور تجزیے کے نتیجے میں جو ادب پیدا ہوگا وہ بھی یقیناً گھٹیا اور بے وزن ہوگا۔ ایسی صورت میں مغربی شعر و ادب اور تنقید کی طرف بار بار مڑ کر دیکھنا کتنا ضروری ہے، یہ

سمجھنے کی بات ہے اور مغرب سے استفادہ کرنے والے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کو مغرب زدہ، فیشن پرست وغیرہ کہنا نادانی یا احساس کمتری کا کھلا مظاہرہ۔'' (معنی کی تلاش، پروفیسر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۷)

سوال یہ ہے کہ وہ کس تنقیدی مکتب فکر کے پیروکار یا مقلد تھے، یا اپنے تنقیدی خیالات کی تشکیل میں کن مکتباتی عناصر یا ادبی رجحان کو اہمیت دیتے تھے، ان کی تنقیدی تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر اعجاز علی ارشد نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں کافی وزن ہے:

''بہر حال وہاب اشرفی کے مختلف تنقیدی مضامین کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ امریکی تنقید کے اصول 'New Criticism' سے خاصے متاثر ہیں۔ نئی تنقید ایک باضابطہ اسکول کے تحت امریکہ میں وجود میں آئی جس کے اہم علم بردار ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، کلینتھ بروکس، جان کرورینسم اور ایلن ٹیٹ ہیں۔ وہاب اشرفی بھی ان ہی نقادوں کی طرح متنی تنقید (Textual Criticism) پر زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ابہام کی تلاش بھی ہے، ابہام کی اہمیت پر زور بھی ہے، تاثر کی تفہیم کی کوشش بھی ہے اور ابہام اور پیکروں کی تلاش کے پہلو بھی ہیں اور ان ہی فن پاروں کی روشنی میں وہ فن پاروں کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔'' (بہار میں اردو تنقید، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، دی آرٹ پریس پٹنہ، ۱۹۸۱ء، ص ۹۵ و ص ۹۶)

حالاں کہ وہاب اشرفی تنقیدی معاملات و مسائل میں بہت زیادہ سخت گیر نہیں تھے، ان کے یہاں ریاست بہار ہی کے مغرب پرست اور پیش رو ناقد کلیم الدین احمد جیسی سختی نہ تھی، مگر ان کی تحریروں اور انداز و اسلوب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر ان کے بھی قریب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آخر الذکر کتاب ''معنی کی تلاش'' کا انتساب انہیں کی طرف کیا گیا ہے۔ ''افسانے کا منصب''، ''شعر اقبال کا علامتی پہلو''، ''نثری نظم''، ''کنکریٹ شاعر''، ''معنی کی تلاش'' اس کتاب کے اہم مضامین ہیں۔ وہاب اشرفی نے جو کچھ لکھا غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد لکھا ہے۔ اپنی تمام رایوں کی ذمہ داری وہ خود لیتے تھے، کسی اور پر نہیں تھوپتے تھے، ایک جگہ حرف آغاز میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس کا احساس ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، غور و فکر کے بعد لکھا ہے، اس لئے میں اپنی تمام رایوں کا ذمہ دار ہوں اور ان پر مکمل اعتماد ہے۔'' (معنی کی تلاش، ص ۷)

وہ تمام ترقی یافتہ ادب کے مطالعہ کی دعوت دیتے تھے اور ادب میں آفاقی قدروں کی ترویج کے حامی تھے۔ مغرب و مشرق دونوں پیمانے ان کی نظر میں محبوب تھے۔ وہ ادب کے بارے میں منفرد منطقی جمالیات کے قائل تھے، لکھتے ہیں:

''میں ادب کو پروپیگنڈہ نہیں سمجھتا، نہ ہی میں اسے کسی سیاسی منشور کا ترجمان مانتا ہوں۔ اقتصادیات سے ادب کو بیر نہیں ہے، لیکن ادب اقتصادی مسائل کی کھتونی نہیں، نہ ہی جنسیات کا پشتارہ ہے۔ ادب کی ایک ہی منطق ہے اور وہ منطق ہے جمالیات کی۔'' (معنی کی تلاش، ص ۸)

وہاب اشرفی ''کیا'' سے زیادہ ''کیسے'' کو اہمیت دیتے تھے۔ گویا کوالٹی اور کیفیت ان کو محبوب تھی، کوانٹٹی اور مقدار کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، یا بالفاظ دگر یہ کہہ لیجیے کہ مواد سے زیادہ اس کی ہیئت اور اس کا انداز و اسلوب پیش کش انھیں پسند تھا اور اسی لیے وہ کہتے تھے کہ معمولی مضمون اور فرسودہ موضوع کو بھی ایک فن کار اگر وہ احساس جمال اور تخلیقی جوہر سے ثروت مند ہے، اپنی تخلیقی صلاحیت کے بل پر وقیع اور غیر معمولی بنا سکتا ہے۔ اسی کتاب میں آگے لکھتے ہیں:

''کوئی موضوع اپنے آپ میں وقیع نہیں۔ فن کار کا احساس جمال اسے وقیع بنا دیتا ہے، اس لیے میری نگاہ میں کسی ادب پارے میں 'کیا کہا گیا ہے' اتنا اہم نہیں ہے جتنا 'کیسے کہا گیا' اہم ہے۔'' (معنی کی تلاش، ص ۸)

اور اسی رویے کے پیش نظر انھوں نے مشہور شاعر جمیل مظہری کی شاعری پر لکھتے ہوئے یہ سطریں لکھی تھیں:

''مجھے اس کی فکر نہیں کہ جمیل مظہری کی غزلوں میں تغزل کی کیا کیفیت ہے؟ یا ان کی نظموں میں کون سا نظام

زندگی منظوم ہوا ہے، مجھے اس کی تلاش نہیں کہ ان کے خیالات کتنے اعلی وارفع ہیں۔ مجھے ان کے تخلیقی رویے سے بحث ہے، الفاظ کے برتاؤ سے غرض ہے، ان کے استعارے کے نظام اور پیکر تراشی کے طریقۂ کار کی تفہیم مقصود ہے۔'' (معنی کی تلاش، ص۱۱۱)

وہاب اشرفی نئے رجحانات اور نئی تحریکوں کے بھی عاشق تھے۔ وہ تمام رجحانات اور اس کے اہم اجزا کو مستحسن سمجھتے تھے۔ وہ تکرار اور فرسودگی کے مقابلے میں جدت وندرت کے قدرداں تھے۔ نہ انھیں ترقی پسندیت سے بیر تھا اور نہ ہی وہ جدیدیت کو اپنا رہ نما اور آئیڈیل ماننے کے طرفدار تھے:

''ترقی پسندی' میری چڑ نہیں ہے نہ ہی 'جدیدیت' میرا آئیڈیل ہے۔ ہاں تکرار اور فرسودگی کے مقابلے میں جدت اور انفرادیت کی قدر کرتا ہوں۔'' (معنی کی تلاش، ص۸)

ان کے مضامین میں مغربی حوالے بہت ملتے ہیں۔ ان کے ایک مضمون ''افسانے کا منصب'' میں مغربی حوالوں کی کثرت ہے۔ انھوں نے مغربی حوالوں سے اردو کے افسانہ نگاروں پر بھی گفتگو کی ہے، لکھتے ہیں:

''صنف افسانہ.....شاعری کے بہت قریب ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر یا اچھے شعر کی بحث میں جدلیاتی الفاظ کے استعمال نیز ابہام اور اجمال کے اوصاف کو ناگریز بتایا ہے۔ ہربرٹ ریڈ بھی قریب قریب انہی امور پر زور دیتا ہے۔ اب اگر نئے افسانوں کے مزاج پر غور کیجیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ خصوصیات ان میں موجود ہیں، چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ افسانہ شاعری سے بہت زیادہ قریب ہے یا ہوسکتا ہے۔'' (معنی کی تلاش، ص۲۷)

وہاب اشرفی زنجیروں میں بندھنے والے ناقد نہیں تھے، وہ ہر مفید تبدیلی پر لبیک کہنے کے روادار تھے اور اس معاملے میں مشرق ومغرب کی دیوار کو حائل کرنا مناسب نہیں گردانتے تھے۔ وہ مغرب سے برآمد ہونے والے نئے اور مفید اقدار و معیار ادب کے بھی پر جوش حامی تھے۔ ان کے تنقیدی افکار ونظریات اور ان کی تنقیدی تحریروں کے عمیق مطالعے کے بعد ان کے تنقیدی رویے کی تعیین میں جو سطریں پروفیسر اعجاز ارشد نے لکھی ہیں، ان کا اعادہ کرنا تکرار نہیں ہوگا، لکھتے ہیں:

''وہ اردو ادب اور شاعری کی افہام وتفہیم میں مغربی اصول نقد سے کام لینا نہ صرف مناسب سمجھتے ہیں بلکہ اس کے پر جوش حامی بھی ہیں.....وہاب اشرفی خیالات سے زیادہ ان کے طریقۂ اظہار کو اہمیت دیتے ہیں۔ 'معنی کی تلاش' میں شامل ان کے تنقیدی مضامین کے مطالعہ سے بھی یہ حقیقت نمایاں ہوجاتی ہے کہ ان کی نظر میں خیال کی چنداں اہمیت نہیں، چونکہ خیال کوئی نیا نہیں ہوتا، نہ ہی کوئی موضوع جدید ہوسکتا ہے۔ ترتیب کی مختلف صورتیں اسے نیا بناتی ہیں، اس لیے کسی بھی فن یا فن کار کا مطالعہ کرتے وقت پیشکش کے طریقے کو جس کا براہ راست تعلق احساس جمال سے ہے، ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔ باقی تمام چیزیں مثلاً ادب اور سماج کا رشتہ یا ادب کا نفسیاتی پس منظر وغیرہ ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔'' (بہار میں اردو تنقید، ص۹۲)

وہاب اشرفی امریکہ میں جنم لینے اور پنپنے والی جس نئی تنقید اور اس کے اصول سے متاثر ہیں، اس کا ثبوت بھی ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ وہاب اشرفی کی کتاب ''نئی قدریں'' میں انہیں ناقدین ادب کی نگارشات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جو مغرب کی نئی تنقید سے وابستہ رہے ہیں۔ قارئین پر یہ نکتہ بھی واضح اور ظاہر رہنا چاہیے کہ وہاب اشرفی نے صرف نئی تنقید کے بطن سے جنم لینے والے مغربی افکار وآرا کو اپنی تحریروں میں برتا اور اپنایا ہی نہیں، بلکہ ان اصول اور عوامل کو اردو میں متعارف بھی کرایا اور اس کی توضیح وتوسیع بھی کی۔ شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ہاشمی اور وہاب اشرفی کے درمیان ''مورچہ'' میں جو ادبی نوک جھونک ہوئی تھی، اس سے بھی اردو میں مغربی ادبیات کے اصول کی کافی کچھ توضیح ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ وہاب اشرفی ایک کشادہ ذہن کے حامل ناقد تھے، وہ کسی مخصوص ازم یا رجحان وتحریک سے ذہنی وابستگی کو ادب کی صحت کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے، مگر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک مابعد جدید ناقد تھے، مابعد جدیدیت سے وابستہ افکار ونظریات سے ان کی وابستگی بہت گہری تھی۔ ۞۞

ڈاکٹر محمد ثاقب انور
Sarweli, Post. Baraidgah, Via. Kasba, Purnia - 854330 (Mob. 9801261623)

ماسٹر رام چندر: حیات وخدمات

اردو کی ادبی وعلمی تاریخ کے حوالے سے انیسویں صدی عیسوی یقینی طور پر ایک انقلابی صدی کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ اس صدی کے اہم اور مشہور تعلیمی و تصنیفی اداروں میں جہاں ایک طرف اورینٹل کالج لاہور، سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ اور انجمن پنجاب لاہور کا نام آتا ہے، وہیں دہلی کالج اور دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا نام بھی نہایت روشن اور معروفِ زمانہ ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ پہلا علمی ادارہ جس میں اردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ ہوا، دہلی کالج ہی ہے، جسے اب تاریخ ''قدیم دہلی کالج'' یا ''مرحوم دہلی کالج'' کے نام سے یاد کرتی ہے۔

دہلی کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا تھا اور دو سال بعد ۱۸۲۷ء میں یہاں انگریزی تعلیم کی شروعات ہوئی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مغربی علوم سکھانے کی غرض سے یہ کالج قائم کیا تھا اور اسے اُس زمانے میں یوں نسبتاً تیزی سے مقبولیت بھی ملی تھی کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ۱۸۳۱ء میں یعنی محض چار سال کے وقفہ میں یہاں پڑھنے والوں کی تعداد تین سو کے آس پاس پہنچ چکی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ اس کالج نے محض ۳۲ سال عمر پائی اور ۱۸۵۷ء کے غدر میں اسے نذرِ آتش کر دیا گیا اور اس کا عظیم الشان کتب خانہ بھی جل کر خاک ہوا اور اس کالج کے پرنسپل ٹیلر کا بھی قتل ہو گیا، لیکن اپنی تقریباً تیس سالہ زندگی میں اس کالج اور یہاں کی مجلس ترجمہ کے ذریعہ علم وادب کی جو خدمتیں ہوئیں اور یہاں سے تعلیم حاصل کر کے اور پھر اس کالج میں بحیثیت استاد تقرری پا کر جن شخصیتوں نے اردو ادب میں شہرت اور بقائے دوام حاصل کیا، وہ بہر حال ایک عظیم یادگار ہے۔ پیارے لال آشوبؔ، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد اسی کالج کے پروردہ تھے اور یہی کالج اُس شخصیت کا بھی مادرِ علمی تھا، جس کے نام سے اس مضمون کے عنوان نے زینت پایا ہے یعنی —— ماسٹر رام چندر۔ انہوں نے اسی کالج میں تعلیم بھی پائی اور پھر اسی کالج میں استاد بھی مقرر ہوئے۔

اردو نثر کی ترقی اور خصوصاً اردو میں علمی نثر کی ترقی کے تاریخی حال واحوال کا بیان ہو اور انیسویں صدی میں شمالی ہند کی لٹریری سوسائٹی دلی کے حوالے سے ماسٹر رام چندر کا نام فراموش کر دیا جائے، ایسا یقیناً ممکن نہیں۔ ماسٹر رام چندر دہلی کے ایک خوشحال خاندان کے فرد تھے، ان کے والد کا نام سندر لال ماتھر تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں نائب تحصیلدار اور تحصیلدار کے عہدے پر رہے۔ رام چندر کی ولادت کا سال ۱۸۲۱ء ہے تقریباً ۶۰ سال عمر پا کر ۱۱/اگست ۱۸۸۰ء کو انہوں نے وفات پائی۔

رام چندر کی عمر ابھی دس سال ہی تھی کہ ۱۸۳۱ء میں ان کے والد چل بسے اور پھر ماں نے ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا اور زمانے کے لحاظ سے انگلش اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا گیا، جہاں وہ چھ سال تک زیر تعلیم رہے۔ اسکولی تعلیم کے دوران ہی، کم عمری میں خوش حال رائے کی بیٹی سیتا سے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ قسمت کی بات کہ لڑکی بہری اور گونگی نکلی، لیکن انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس کے ساتھ نباہ کیا۔ (تفصیلات: مونوگراف ''ماسٹر رام چندر، مولفہ صدیق الرحمٰن قدوائی، ناشر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، اگست ۱۹۶۱ء) رام چندر کے خسر صرف نام ہی کے خوش حال نہ تھے، بلکہ سچ مچ ان کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی، بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ خیر سے ان کی سسرال بہت امیر تھی، لہٰذا اپنی ماں اور پھر اپنی بیوی کے زیورات اور سسرالی اثاثہ کی مدد سے اخراجات کی کچھ مشکلیں حل ضرور ہوئیں، لیکن تعلیم ترک کر کے بہر حال انہیں ملازمت کی طرف بھی آنا پڑا، البتہ نوجوان رام چندر میں علم کی پیاس ایسی تھی کہ وہ اُسے بجھانے کے لئے نوکری چھوڑ کر پھر پڑھائی میں لگ گئے اور دہلی کالج سے تعلیم پا کر، وہیں معلم بھی بنے۔ انہیں قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہانت ملی تھی جس کی بدولت نہ

صرف یہ کہ وہ اپنے تعلیمی دور میں اساتذہ کے منظور نظر ہوئے بلکہ انہیں تیس روپے ماہوار کا وظیفہ بھی ملنے لگا۔

ماسٹر رام چندر علم ریاضی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی کتابوں کے ترجمے میں بھی بڑے ماہر تھے اور انہیں اخباروں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ دہلی کالج میں رہ کر انہوں نے گیارہ کتابیں لکھیں جو شائع بھی ہوئیں۔ ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے لئے انہوں نے الجبرا اور علم مثلث کی جو کتابیں لکھیں، وہ نہ صرف نصاب میں شامل ہوئیں بلکہ ان کی ایک کتاب کا شہرہ یوروپ تک پہنچا اور اسے ایسی مقبولیت ملی کہ دہلی میں جشن منایا گیا اور اس وقت کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر آرنلڈ نے انہیں خلعت اور انعامات سے نوازا۔

یہ ۱۸۴۲ء کی بات ہے کہ جب دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر کی نگرانی میں، اردو زبان میں تصنیف وترجمہ کے کاموں کو ترقی دینے کی غرض سے ایک ادبی انجمن قائم کی گئی تو ماسٹر رام چندر اس کے روح رواں کی حیثیت سے مسلسل کام کرتے رہے۔ اس انجمن کی

کارکردگی کے زیر اثر اردو نثر میں سلاست وسادگی نے جگہ پائی اور اس کی دلکشی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، ساتھ ہی ساتھ مضمون نویسی کو بھی یہاں نمایاں فروغ ملا۔ ماسٹر رام چندر نے اعظم ترین اور اقل ترین (A Treatise on Maxima and Mimima) اور اقل احصا پر جو کتابیں لکھیں وہ علم ریاضی میں ان کے تبحر کی گواہ ہیں۔ علم ریاضی میں اپنی کتاب پر ہونے والے علمی اعتراض رفع کرنے کی غرض سے ۱۸۵۱ء میں انہوں نے کلکتہ کا کامیاب سفر بھی کیا تھا۔

رام چندر دہلوی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ نہ صرف طبیعات کے ماہر تھے بلکہ علم ہیئت، عربی، فارسی اور انگریزی میں بھی بے پناہ دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے وسیع اور گہرے مطالعہ کے زیر اثر عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اپنے نام کے آگے ''یسوع داس''

عقل اور تربیت کا رشتہ

عقل جو انسان میں پائی جاتی ہے، وہ مانند ایک پتھر سنگ مرمر کے ہے جو کان میں مٹی سے آلودہ دبا ہوا ہے اور تربیت مانند اس کاریگر کے ہے کہ جو پتھر کو نکال کر صاف اور درست کیا کرتا ہے۔ جب تک سنگ مرمر کو کاریگر مذکور کان میں سے نکال کر صاف نہیں کرتا ہے، تب تک خوبصورتی اور رونق سنگ مرمر کی کہاں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طور سے جب تک آدمی کو تربیت نہیں ہوتی اس وقت تک عقل اور صفات جبلی جو اللہ تعالیٰ نے اسے بخشے ہیں، ظاہر نہیں ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہزار ہا گنوار اور دیہاتی ایسے گزرے ہوں گے کہ ان کو خدائے تعالیٰ نے اس قدر ذہن اور عقل بخشی ہو جیسی کہ حکیم ارسطو کو حاصل تھی۔ اب کوئی پوچھے کہ کیوں حکیم ارسطو نامی حکیم ہوا اور گنوار مذکور حالت جہالت ہی میں مر گئے اور نام ونشان بھی نہیں رہا۔ اس کا جواب فقط یہ ہے کہ ارسطو کو تربیت ہوئی تھی اور ان کو نہیں ہوئی۔ ارسطو نے کتب اور تصنیفات حکمائے گزشتہ کو ملاحظہ کیا اور گنوار مذکور کشت کاری کرتے کرتے مر گئے۔ اگر مانند ارسطو کے ان کو بھی قابو واسطے تحصیل کتب کے ہوتا تو شاید وہ گنوار، ارسطو سے بھی سبقت لے جاتے۔ ایک شاعر نے سچ کہا ہے کہ گنواروں اور غریبوں کے ذہن اور عقل سے کون آگاہ ہوتا ہے۔ وہ مانند اُن جواہرات کے ہیں جو اندر سمندر کے پڑے ہوئے ہیں اور انسان کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں یا وہ مانند ان خوشبودار پھولوں کے ہیں جو دشت لق ودق میں شگفتہ ہیں، ان کی خوشبو کو کون سونگھتا ہے۔ تربیت ایک ایسی شے ہے کہ ورثہ میں نہیں حاصل ہوتی ہے یعنی یہ بات غیر ممکن ہے کہ اگر باپ تربیت یافتہ ہو تو بالضرور اس کا بیٹا بھی تربیت یافتہ ہو۔ یہاں سے یہ بات ہر انسان پر فرض ہے کہ اچھی تربیت پانے میں کوشش بلیغ کرے اور اس میں تغافل اور کاہلی کو جائے نہ دے۔

(عجائبات روزگار، ص ۸۵ وص ۸۶، بحوالہ مونوگراف ماسٹر رام چندر، ص ۷۴ وص ۷۵)

لکھنے لگے تھے۔ باقاعدہ ''اصطباغ'' کے بعد، دہلی کالج کی تباہی کے ایام میں انہیں مشکلات اور دربدری کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

غدر کا زمانہ ان کے لئے آزمائشی زمانہ تھا جب کہ انگریزی کیمپ میں پہنچ جانے کی بدولت ہی انہیں امان مل سکی اور چند ماہ بعد جنوری ۱۸۵۸ء میں وہ ٹامس انجینئرنگ کالج رڑکی میں ٹیچر ہوئے، پھر دہلی ڈسٹرکٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے اور یہاں سے ۱۸۶۲ء میں سبکدوشی کے بعد ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات اور مہاراجہ کے اتالیق کی حیثیت سے خدمتیں انجام دیتے رہے۔

ماسٹر رام چندر کی تصانیف متنوع علمی موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ریاضی میں ''اصول جبر ومقابلہ'' (۱۸۴۵ء) اور ''اصول علم ہیئت''، ''تاریخ وسوانح میں''، ''تذکرۃ الکاملین'' (۱۸۴۹ء) ''علم معلومات میں''، ''عجائبات روزگار'' (۱۸۴۷ء) کے علاوہ ''علم مناظرہ میں''، ''اعجاز القرآن''، ''سماجیات میں''، ''بھوت نہنگ'' (۱۸۵۵ء) ان کی اہم کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ''تفرقی احصا کا ایک نیا طریقہ'' (۱۸۶۳ء) ''رسالہ مسائل کلیات وجزئیات'' (۱۸۵۰ء) ''رسالہ اصول کلوں کے باب میں'' (۱۸۶۳ء) ''علم طبیعی'' (۱۸۵۱ء) ''سریع الفہم'' (۱۸۴۹ء) ''اصول علم حساب جزئیات وکلیات'' (۱۸۴۵ء) ''علم مثلث وتراش ہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر'' (۱۸۴۴ء) بھی ان کی یادگار رہے۔

ماسٹر رام چندر ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ انہوں نے سائنسی معلومات پر مبنی اردو کا پہلا باتصویر پرچہ جاری کیا جس کا نام ''فوائد الناظرین'' ہے۔ یہ رسالہ مارچ ۱۸۴۵ء میں نکلا تھا۔ دوسرا ماہنامہ انہوں نے ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے نکالا جو بعد میں ''محبّ ہند'' کے نام سے نکلتا رہا، جیسا کہ ''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر اعجاز حسین نے ان کی اولیات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سائنس وغیرہ پر بلیغ مضامین لکھ کر اردو میں انشائیہ کی بنیاد قائم کی اور متعدد اخبارات کے ذریعہ سے اردو کو علمی وادبی مضامین سے روشناس کرایا۔ انہوں نے نہ صرف اردو کو مالا مال کرنے کے لئے خامہ فرسائی کی بلکہ اپنے اردگرد انہوں نے ایسے ارباب ذوق کا حلقہ بنا لیا تھا جو اردو کے ممتاز معمار سمجھے گئے۔ محمد حسین آزاد، نذیر احمد، ذکاءاللہ وغیرہ سب ان کی شاگردی سے فیض یاب ہوئے۔ اگر ماسٹر رام چندر نے علمی مذاق سے ان بزرگوں کی تربیت نہ کی ہوتی تو اردو نثر آنے والے دور کے مطالبات کو اتنی خوبی سے پورا نہ کرسکتی۔ ماسٹر رام چندر کی تحریریں زیادہ تر سائنس و ریاضی سے متعلق ہیں اس لئے ان کی عبارت میں ادبیت کی کمی ہے اور بیان جوش سے خالی ہیں، لیکن مدلل اور منطقی انداز ان سب باتوں کی کمی پوری کردیتا ہے۔ ان کا انداز بیان گفتگو کا پہلو لئے ہوئے ہے، زبان بڑی سادہ ہے۔ انہوں نے اپنی طرز نگارش سے اردو نثر میں فکر انگیز موضوعات قلم بند کرنے کی جو بنیاد ڈالی وہ آگے چل کر سرسید کے بھی کام آئی۔'' (مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۲۱۵)

''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' جلد اول میں بھی لفظ ''رام چندر'' کے تحت ان کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ان کا انداز تحریر نہایت سلجھا ہوا اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں قدامت کا انداز جھلکتا ہے۔ وہ قدیم وجدید نثر کی درمیانی کڑی ہیں۔'' (رام چندر، ماسٹر، ص ۲۷۱)

اردو مضمون نویسی کی تاریخ میں، بلکہ یوں کہا جائے کہ اُس کی بنیاد ڈالنے والوں میں ماسٹر رام چندر کا یقیناً ایک ایسا مرتبہ ہے، جسے بھلایا نہیں جاسکتا، اسلوب نگارش کے اختصاص کی بات تو الگ ٹھہری، جہاں تک موضوعات میں تنوع کا معاملہ ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ''فوائد

حرکت مطلق اور حرکت نسبتی

حرکت یا تو مطلق ہوتی ہے یا نسبتی، جب کہ ایک جہاز کنارۂ سمندر سے روانہ ہوتا ہے تو اس کی حرکت بلحاظ کسی شئے کے کہ خشکی پر قائم ہو، حرکت مطلق، خیال کی جاتی ہے، لیکن جب کہ اس کے مقام کو کسی اور جہاز کی نسبت کہ وہ بھی متحرک ہو، خیال کرتے ہیں تو اس کی حرکت کو حرکت نسبتی کہتے ہیں۔ (رسالہ اصول، ماسٹر رام چندر)

الناظرین'' اور'' محبّ ہند'' کی دستیاب فائلوں میں ان کے جومضامین محفوظ ہیں، نہ صرف یہ کہ ان کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے بلکہ عجب بالائے عجب یہ ہے کہ ایک ایک موضوع کے تحت آنے والے مضامین دس بیس نہیں پچاس کے آس پاس پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً سوانحی اور تاریخی مضامین کی طرف دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ''بادشاہت غزنی کے بیان میں'' بھی قلم اُٹھایا ہے۔ بوعلی سینا، محمود غزنوی، حکمائے یونان بقراط وسقراط، فلاطون وارسطو کے حال واحوال بھی لکھا ہے۔ تاریخ ایران وانگلستان، زرتشت، فردوسیؔ پر بھی ان کے مضامین ہیں اور ان کے یہاں تلسی داس اور سورداس کا تذکرہ بھی ہے اور ''تواریخ ملک اودھ''، ''تواریخ بنگال'' وغیرہ بھی، پھر انہوں نے مختلف شہروں کے احوال اور ''سکندراعظم'' اور ''کنفیوشس'' کے احوال بھی بصورت مضامین قلمبند کئے ہیں۔

ماسٹر رام چندر کے یہاں سائنسی مضامین کا بھی ایک جہاں آباد ہے۔ علم ''طبیعات''، ''بیان پن چکی کا''، ''بیان کسوف وخسوف'' کے علاوہ ان کے یہاں ''اصول علم حساب''، ''جبرومقابلہ''، ''قوس قزح''، ''ٹیلی گراف''، ''دخانی کشتی''، ''چرخی''، ''مسمریزم''، ''گردش زمین''، ''علم ادات''، ''علم ہیئت''، ''مقناطیس بنانے کی ترکیب'' پر ہی نہیں بلکہ ''علم جرثقیل''، ''دوربین''، ''چھاپے کی ایجاد''، ''طبیعات آواز''، ''نزلہ زکام''، ''دورۂ خون''، ''بیان سیماب''، ''حرارت زمین''، ''ستاروں اور حیوانوں کے بیان'' اور ''خواب'' جیسے رنگارنگ سائنسی موضوعات پر بھی اہم معلوماتی مضامین کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔

اخلاقی اور اصلاحی مضامین کی تلاش کی جائے تو ماسٹر رام چندر کے ''فوائد الناظرین'' اور ''محبّ ہند'' میں اس نوعیت کی تحریریں بھی موجود ہیں۔ ''علم اخلاق''، ''استقلال''، ''رشوت''، ''اعتدال کے فوائد''، ''کفایت شعاری''، ''سستی''، ''مکاری''، ''ضیاع اوقات''، ''خوشامد''، ''غرور''، ''صبر''، ''بیماری''، ''حسد''، ''غصہ''، ''بے رحمی''، ''عیادت''، ''شجاعت''، ''طاقت''، ''تعصب''، ''ہمدردی ومروت''، ''بلند نظری''، ''برداشت''، ''غیبت''، ''لڑکیوں کی تربیت'' اور از یں قبیل بہت سارے عنوانات کے تحت انہوں نے اردو کے اخلاقیاتی اور تربیتی ادب کو مالا مال کیا ہے۔

ان کے یہاں نہ صرف تاریخی عمارات اور مقامات پر متعدد مضامین ملتے ہیں اور '' آہنی سڑک'' اور ''نمک'' کا دلچسپ بیان موجود ہے، بلکہ سماجی اور سیاسی مضامین کی بھی ایک کہکشاں اُن کے یہاں سجی سجائی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے ''فوائد تاریخ''، ''فوائد علوم''، ''قواعد سیاست''، ''حالات گورنمنٹ''، ''ہندوستان میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت''، ''تجارت کے فوائد''، ''چھوٹی عمر میں شادی کے نقصانات'' اور ''مجلسوں کے بیان'' جیسے عنوانات سے جو اصلاحی اور سماجی باتیں لکھی ہیں وہ بجائے خود ان کے یہاں فکر ومطالعہ اور مشاہدے کی انگنت جہتیں روشن کردیتی ہیں اور یقیناً ان میں بہت سارا اساسی و آفاقی نوعیت کا مواد ایسا ہے جو آج بھی پڑھنے والوں کے لئے کارآمد بن سکتا ہے۔ جہاں تک خاص طور سے اردو زبان وادب کا معاملہ ہے، اس سلسلے میں ان کی تحریریں آج بھی چشم کشا کہلانے کا حق رکھتی ہیں۔ انہوں نے صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ:

> ''واضح ہو کہ زبان اردو ایسی ہے کہ بہت بہت دور سمجھی جاتی ہے......اور ظاہر ہے کہ وہی زبان بآسانی تحصیل ہوسکتی ہے جس کے سمجھنے میں چنداں مشکل نہ ہو......اب

رفتار کیا ہے؟

رفتار ایک جسم کی، اندازۂ حرکت اس جسم کا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی ہر گھنٹے میں یکساں چار میل چلے تو اس کی رفتار یعنی اندازۂ حرکت چار میل فی گھنٹہ ہے اور اگر ایک جسم ہر ثانیہ یعنی سکنڈ میں چھ فٹ طے کرے تو اس کی رفتار یعنی اندازۂ حرکت چھ فٹ فی سکنڈ ہے۔ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ واسطے تعبیر کرنے رفتار کے ضرور ہے کہ ایک خاص تعداد احاد مسافت کی ایک خاص واحد زمانے میں طے کی جائے۔ مقرر کرنا ان احاد کا ایک امر اختیاری ہے، لیکن دستور یہ ہے کہ فٹ کو واحد مسافت کا اور سکنڈ کو واحد زمانے کا فرض کرتے ہیں، پس مثال گزشتہ میں فقط یہ کہتے ہیں کہ رفتار جسم کی فقط چھ فٹ ہے۔'' (رسالہ اصول کلوں کے باب میں، بحوالہ مونوگراف ماسٹر رام چندر، ص ۸۸)

اگر غور سے دیکھو تو دریافت ہوگا کہ حیدر آباد دکن سے لے کر سرحد نیپال اور دریائے اٹک تک اور شہر صورت (سورت) سے شہر پٹنہ تک زبان اردو یعنی وہ زبان جو دہلی میں لوگ بولتے ہیں، سمجھی جاتی ہے۔ سوائے اردو کے کوئی ایسی زبان ہندوستان میں نہیں ہے جس کا اس قدر زیادتی سے رواج ہو، مثلاً بنگالی زبان سوائے ملک بنگالہ کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی...... کشمیری زبان سوائے ضلع کشمیر کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی ہے...... لیکن اردو زبان بہت جائے سمجھی جاتی ہے۔ حیدر آباد اور ناگ پور، لکھنؤ، پٹنہ، لاہور اور بہاول پور میں جو مختلف اضلاع ہندوستان میں فاصلوں بعید پر واقع ہیں، زبان اردو سمجھی جاتی ہے۔ پس اگر اس زبان کی وساطت سے علوم شیوع ہوں اور رواج پاویں تو حقیقت میں خلقت ہند کو بہت فائدہ ہے۔'' (خیر خواہ ہند، اکتوبر ۱۸۴۷ء، بحوالہ مونوگراف ماسٹر رام چندر، ص ۴۰)

اسی طرح ایک اور جگہ بھی انہوں نے مشورے اور مشاہدے کے انداز میں اپنے دور کی ادبی وشعری پیش رفت اور اردو کے قلم کاروں کی صلاحیت کا اعترافی طریقے سے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''زبان اردو میں مضامین شاعری وغیرہ کے چند برسوں سے بہت عالی بننے لگے ہیں اور بعض شاعر بالفعل ایسے موجود ہیں کہ وہ مرتبہ برابری کا اکثر شاعروں عربی اور فارسی اور انگریزی وغیرہ سے رکھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر شاعر اردو کے توجہ کریں تو وہ ہر قسم کے اشعار جن کی زبان انگریزی اور رومی یونانی میں بہت شہرت ہے، بنا سکتے ہیں...... پس صاحبان عالی شان اس بات سے دلجمعی رکھیں کہ علم ادب اردو میں زیادتی سے ہے۔''

(محبِّ ہند، جون ۱۸۴۸ء، بحوالہ مونوگراف ماسٹر رام چندر، ص ۴۳ و ص ۴۴)

حقیقت یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر ایک بالغ نظر اور روشن دماغ آدمی تھے۔ انہوں نے مذہب پر جو مناظراتی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں، انہیں اگر ہم تھوری دیر کے لئے الگ رکھ دیں اور خالص زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے دیکھیں تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ اردو کے ذریعہ سائنسی تہذیب پھیلانا چاہتے تھے اور تاریخ وتعلیم کے اصول کے ساتھ قوم وملک کی ترقی میں اردو کی اہمیت بخوبی پہچان بھی رہے تھے اور اس کی پہچان کرانے کے لئے کوشاں بھی تھے۔ ان

مولوی ذکاء اللہ دہلوی

مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی تاریخ ولادت یکم اپریل ۱۸۳۲ء ہے اور جائے ولادت دہلی کا کوچہ بلاقی بیگم۔ وہ ایک بڑے علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے مورث اعلیٰ غزنی سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ذکاء اللہ دہلوی کے والد کا نام ثناء اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محض بارہ سال کی عمر میں ان کا داخلہ دہلی کالج میں ہوا، جہاں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد بھی زیر تعلیم تھے اور ان تینوں میں بے پناہ محبت بھی تھی۔ ذکاء اللہ دہلوی کا پسندیدہ مضمون ریاضی تھا اور کالج سے فراغت کے بعد دہلی کالج میں علم ریاضی ہی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہی انہوں نے اپنی عملی زندگی کی باقاعدہ شروعات کی، پھر آگرہ کالج میں فارسی واردو پڑھانے لگے اور ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے مدرس اعلیٰ اور پھر میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر منتخب ہوئے اور پندرہ برسوں تک عربی وفارسی کا درس دیتے رہے۔ ۱۸۸۷ء میں یہاں سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام تصنیفی وتالیفی کاموں میں بسر کئے اور اپنے وطن ہی میں ۱۰ رنومبر ۱۹۱۰ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ ذکاء اللہ دہلوی، ماسٹر رام چندر اور امام بخش صہبائی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ اگر چہ بسیار نویسی اور زود نویسی نے ان کی تحریروں میں حسب توقع ادبی شان کم کم ہی پیدا ہونے دی، لیکن اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ مختلف موضوعات مثلاً ریاضیات،

معاملوں میں ان کی تقدیمی حیثیت بہرحال مسلم اور لائق احترام ہے۔ ان کی تحریروں میں ایسا مواد بھی موجود ہے جس میں اُس دور کے مشاعرے پر تنقید ملتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عصری تناظر میں مضمون سے روشناس کرانے کا ہنر بھی جانتے تھے اور اس کا بہرصورت بے پناہ جذبہ بھی رکھتے تھے۔

ماسٹر رام چندر کی تحریروں میں مسرت آفرینی کم کم سہی، لیکن رفعت فکر، افادیت خیال اور وضاحت اظہار کے اوصاف روشن ہیں اور ایک موثر تبلیغی رنگ ملتا ہے۔ ماسٹر رام چندر کے ادبی خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح اُس دور کے مشاعرے اور شاعری کی بعض باتیں ان کے نزدیک محل نظر تھیں اور اصلاح کی محتاج، اُسی طرح خطوط نگاری کے مروجہ طرز اور طویل القاب وآداب بھی ان کی نظر میں پسندیدہ نہ تھے اور وہ چند لفظوں کی بات کو کئی کئی سطروں میں لکھے جانے کی روش کو بدلنا ہی مفید سمجھتے تھے۔ غرض کہ اردو بنیادی نوعیت کی اصلاح کے وہ خواہاں تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ذریعہ اردو میں ترجمہ نگاری کے فروغ کی جو راہ کھلی وہ بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

جیسا کہ ذکر آچکا، ماسٹر رام چندر بہرحال علی مضمون نویسی کے حوالہ سے بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے نہ صرف یہ کہ ان کا طرز تحریر اپنے دور کا سب سے اہم طرز تحریر ہے بلکہ ان کے رسالہ اور تصانیف میں اشاعت یافتہ مواد بھی قدر و قیمت سے بیگانہ نہیں ہے، رہی بات وقت کے ساتھ ساتھ خیالات اور ضروریات کے بدلنے کی یا مطالعاتی جہات ونتائج میں فرق محسوس کرنے کی تو وہ اپنی جگہ، مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ ماسٹر رام چندر کی تحریریں اپنا ایک وزن و وقار رکھتی ہیں، ان کے نظریات سے اختلاف عین ممکن ہے، لیکن اس کے وزن اور منطقی انداز بیان سے منکر ہونا علمی خیانت کے مصداق ہی کہا جائے گا۔ بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی:

> ''رام چندر کی علمی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے فکر و نظر اور ترک واختیار کے لئے پیمانے دے کر اور صحافت، تنقید و ترجمہ اور مقالہ نگاری کے لئے معیار قائم کر کے اردو نثر کی کشت ویران کو رہ گزر باد ہونے سے بچالیا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کردی کہ وہ آنے والے زمانے کا ساتھ دے سکے۔ اس میں دل کو کھینچنے والے انــچھــر کم ہیں، لیکن اس پر ایک بڑے مقصد کی چھوٹ، ایک نئے تمدن کا پرتو ہے۔ ان کی تحریروں اور مضمونوں کو پڑھ کر انشا پردازی کا لطف نہیں آتا۔ ادبی مسرت نہیں ہوتی، لیکن یہ نثر نئے زمانے کا اشاریہ ہے۔ اس میں رہبری اور رہنمائی کی صلاحیت اور افادیت اور عقلیت کی جلوہ گری ہے۔'' (مقدمہ ماسٹر رام چندر، ص ۵۰)

❁❁❁

طبیعات، جغرافیہ، علم ہیئت، علم الاخلاق اور سیاست مدن پر انہوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ ان سے پہلے اردو کے کسی انشاء پرواز نے اتنی بڑی تعداد میں کتابیں نہیں لکھی تھیں۔ ''سیر المصنّفین'' میں شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی ۱۴۳ کتابوں کا ذکر ہے جس میں ان کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ان کی کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت مقبول ہوئیں اور برطانوی حکومت نے بھی از راہِ قدر دانی ان کے تحریری کاموں پر انہیں خان بہادر اور شمس العلما کے خطابات سے نوازا اور انہیں اُس وقت کے لحاظ سے خطیر نقد رقم بھی بطور انعام دیا۔ ذکاء اللہ دہلوی ایک اچھے تبصرہ نگار، مضمون نگار اور انشائیہ نویس کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ حالی کی مسدس پر ان کا تبصرہ اس لحاظ سے بہت خاص ہے کہ اس میں انہوں نے اپنا نظریہ شاعری آئینہ کردیا ہے۔ ان کا ''آگ'' جیسا انشائیہ بھی معلومات سے پر ہے۔ انہوں نے ریاضیات اور تاریخ کی جو کتابیں لکھی ہیں ان میں طلبا کے لئے تدریسی وضاحت کا خاص رنگ ملتا ہے۔ وہ بڑے بڑے حالات کو مختصر عبارت میں نہایت آسانی سے لکھ دیتے ہیں۔ ذکاء اللہ دہلوی کا خاص کارنامہ ''تاریخ ہند'' ہے جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک ناتمام تاریخ اسلام بھی ان کی یادگار ہے۔ وہ سرسید سے قلبی محبت رکھتے تھے اور اپنے فرزند عنایت اللہ کو علی گڑھ میں ہی تعلیم دلائی تھی۔ اردو کو شعوری اور منصوبہ بند طریقے سے علمی زبان بنانے میں ان کی خدمتیں تاریخ کا ایک روشن باب کہلانے کی حقدار ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق''، ''مکارم اخلاق'' اور ''محاسن اخلاق'' کے ناموں سے ان کے مضامین کے مجموعے بھی اشاعت یافتہ ہیں۔ (ماخوذ)

شاہنواز عالم
Research Scholar, B.N. Mandal University, Madhepura - 852113 (Mob. 9308626119)

اسماعیل میرٹھی: زندگی اورفن

انیسویں صدی کے نصف آخراور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائی کا زمانہ پانے والے نامور اردو شاعروں میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا نام بہت ہی عزت سے لیا جاتا ہے۔ان کا اصل نام شیخ محمد اسماعیل اور وطن میرٹھ ہے۔ان کے مورث اعلیٰ کا نام قاضی حمید الدین خجندی اوراُن کے والد محترم کا نام شیخ پیر بخش تھا۔ اسماعیل میرٹھی کی ولادت اپنے آبائی وطن میں ہوئی اور یہیں انہوں نے وفات بھی پائی۔اسماعیل میرٹھی کی تاریخ پیدائش ۱۲رنومبر ۱۸۴۴ءاور تاریخ رحلت یکم نومبر ۱۹۱۷ء ہے۔گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد،مرزا غالبؔ کی ''قاطع برہان'' کا جواب ''ساطع برہان'' لکھنے والے مرزا رحیم بیگ سے انہوں نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم اور پھر نارمل اسکول میرٹھ سے تدریسی اہلیت کی سند حاصل کی۔ ابھی ان کی عمر ۱۶ سال کے آس پاس ہی تھی کہ انہیں ملازمت کا بوجھ اٹھانا پڑااورسررشتہ تعلیم سے منسلک ہوکر ۲۸ برسوں تک سہار نپوراور میرٹھ کے تحتانی اورفوقانی مدارس میں فارسی پڑھاتے رہے۔۱۸۸۸ءمیں ان کی تقرری آگرہ کے ایک اسکول میں ہوئی اور وہیں سے ۱۸۹۹ء میں سبکدوش ہوئے۔انہیں اگرچہ اپنے تعلیم دور سے ہی علم ہندسہ،فزیکل سائنس اور علم ہیئت میں دلچسپی تھی اوران مضامین کی تعلیم کے لئے رڑکی کالج میں انہوں نے داخلہ بھی لیا تھا، مگر کورس مکمل کئے بغیر وطن لوٹ آئے۔ انہیں ملازمت کے آخری ایام میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کا عہدہ پیش کیا گیا تھا،لیکن اس زمانے تک حقہ کے بہت ہی شوقین مولوی اسماعیل میرٹھی کئی امراض کے شکار ہوچکے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی اورسبکدوشی کے بعد بقیہ مدت حیات، اپنے وطن میں گزار کر چل بسے۔

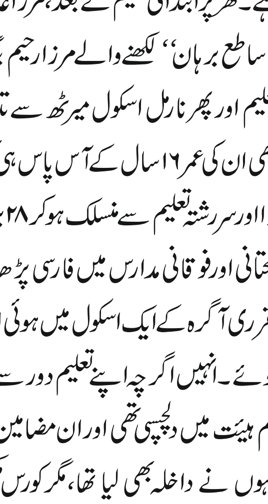

اسماعیل میرٹھی انشاپرواز بھی تھےاور شاعر بھی، لیکن ان کی خاص اور دوامی شہرت کا باعث وہ اردو ریڈرس ہیں جوانہوں نے بچوں کے لئے لکھی تھیں۔ان کی یہ درسی کتابیں نہ صرف اپنے وقت میں مروج اور مقبول رہیں بلکہ آج بھی ان کی بدولت اردو نصابیات کی رونق برقرار ہے۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی
ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

انہوں نے سررشتہ تعلیم میں رہ کر بچوں کے دل ودماغ،ان کے مزاج اور اس کی پسند ونفسیات سے بہت گہری اور بہت نزدیکی پہچان بنا رکھی تھی جو دوسروں کو بہرحال نصیب نہ تھی، چنانچہ انہوں نے ایک خاص انداز میں اور کچھ خاص مزاج شناسی کے ساتھ بچوں کے لئے ایسی کتابیں لکھیں اور ایسی چھوٹی چھوٹی خوبصورت نظمیں تحریرکیں جوانہیں اَمر بنا گئیں، کیونکہ وہ پڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں کو یکساں انداز سے متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اوران کی شاعری کا یہ وصف آج بھی اُن کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف صاف محسوس ہوتا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کی یہ درسی کتابیں نہ صرف زبان و بیان، مضامین اور تدریسی نقطہ نظر سے ایسی موزوں اور کارآمد پائی گئیں کہ گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصہ تک داخل نصاب رہیں، بلکہ اب بھی اردو نصاب کی تیاری میں جزوی طور پر سہی،لیکن ضرور کام آتی ہیں۔

اسماعیل میرٹھی سررشتہ تعلیم میں ملازمت کے دوران اپنے ہم وطن قلقؔ میرٹھی کی پندرہ مترجمہ نظموں کے مجموعہ ''جواہر منظوم'' سے بے حد متاثر ہوئے تھےاور یہی تاثر،ان کے لئے شاعری کی طرف آنے کا محرک بنا، پھر منشی ذکاءاللہ دہلوی اور محمد حسین آزاد سے ملاقاتوں نے بھی

انہیں تحریک دلایا، یہاں تک اپنی ادبی خدمات کے صلے میں وہ ''خان صاحب'' کے خطاب سے بھی نوازے گئے، لیکن بچوں کا ادب، درحقیقت اسماعیل میرٹھی کی ادبی شخصیت کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس میں دورائے نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرسید کی تحریک عقلیت پسندی کے زیراثر بڑوں کے لئے، ان کے لہجہ میں لکھنے والے بہت تھے، لیکن بچوں کے لہجہ میں سامنے کی باتیں کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے وقت میں بچوں کے لئے بنیادی تدریسی سطح پر اردو قواعد اور ابتدائی کتابوں کی ترتیب کا جو کام پنجاب میں محمد حسین آزاد انجام دے رہے تھے، اسی نوعیت کا کام ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں اسماعیل میرٹھی نے انجام دیا، جس کی تاریخی اہمیت اور دیرپا و دوررَس عصری افادیت مسلم ہے۔

بلاشبہ اسماعیل میرٹھی ہماری اردو شاعری کا ایک ایسا نام ہے، جس کا تذکرہ صرف ''بچوں کا شاعر'' کہہ کر مختصر نہیں ہوسکتا، کیونکہ انہوں نے ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں، جن کی بنیاد پر انہیں نظم جدید کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں روایتی انداز کی غزلیں بھی ہیں، انگریزی نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔ انہوں نے اردو کی پہلی بے قافیہ نظم بھی لکھی ہے۔ وہ اردو میں نظم معریٰ کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی خیالی دنیا میں رہنے والے آدمی نہیں بلکہ حقیقی دنیا میں رہنا پسند کرنے والے ایک بالغ نظر مخلص اور راست گو آدمی تھے۔ انہیں غزل، رباعی اور دیگر اصناف شاعری میں مہارت حاصل تھی۔ ''ریزۂ جواہر'' کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۸۸۵ء میں چھپا تھا جس میں انگریزی سے ترجمہ شدہ نظمیں بھی ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی کلیات مطبوعہ ۱۹۰۱ء میں قصیدے، سلام، مراثی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے بجا طور پر اسماعیل میرٹھی کو حاؔلی کے بعد سب سے اچھا اردو شاعر کہا ہے۔ اپنی مشہور کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

> ''جو چیز انہیں ذکر کا مستحق بناتی ہے۔ وہ ان کی دیہی شاعری ہے۔ آزاؔد کی طرح انہوں نے بھی نیرنگ قدرت کے نقش و نگار کھینچنے کی کوشش کی اور اس میں انفرادی رنگ بھی حاصل کیا۔ اگر ان کی نظموں میں شان وشوکت نہیں تو بے مزہ اور بے رنگ سادگی بھی نہیں۔ ان کی سادگی میں ایک قسم کی دلکشی ہے۔ ان کی تصویریں عام نہیں خاص ہیں اور ہندوستانی فضا میں سانس لیتی ہیں اور ان تصویروں کو ان کی آنکھوں نے دیکھا ہے، یہ خیالی یا مصنوعی نہیں۔ ان کی نظموں کے موضوع کچھ نئے نہیں، شفق، رات، گرمی کا موسم، برسات، صبح، تاروں بھری رات، انہیں چیزوں کا بیان ہے، لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ نظمیں رسماً نہیں لکھی گئی ہیں۔ شاعر کی آنکھوں نے ان چیزوں کی دل فریب نیرنگیوں کو دیکھا ہے اور وہ جزئیات کو بھی نہیں بھولتا...... (ان کی نظموں میں) صفائی وسادگی نمایاں ہے، تازگی بھی ہے اور......ترنم بھی

ناصؔر زیدی

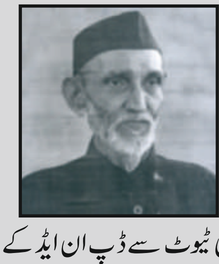

ناصؔر زیدی کا پورا نام سید ناصر حسین زیدی ابن علامہ سید عدیل اختر، جائے ولادت علی نگر پالی ضلع جہان آباد اور تاریخ ولادت ۱۵ مئی ۱۹۲۴ء ہے اور تاریخ وفات ۳ رنومبر ۲۰۰۳ء۔ ناصؔر زیدی کا تاریخی نام خورشید حیدر تھا جس سے ان کی ولادت کا ہجری سال ۱۳۴۲ھ برآمد ہوتا ہے جو مذکورہ عیسوی سال کے مطابق ہے۔ ان کی رسم بسم اللہ مولانا سید نجم الحسن نے ادا کی اور پھر تعلیم کا باقاعدہ آغاز جامع العلوم جوادیہ بنارس سے ہوا۔ یہاں سے فخرالافاضل کی سند لینے کے علاوہ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل اور تفسیر شیعی میں فضیلت کی سند اور پھر فارسی، تفسیر سنی، فلسفہ، فقہ شیعی کی سند فضیلت بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ پٹنہ سے حاصل کیا اور بہار اسکول اکزامینشن بورڈ پٹنہ سے میٹرک اور عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ڈپ ان ایڈ کے امتحانات بھی پاس کئے۔ انہوں نے اوائل عمر میں اپنے والدین کے ساتھ پشاور میں رہتے ہوئے پشتو زبان بھی سیکھی تھی۔ ناصؔر زیدی نہ صرف تبلیغی، تعلیمی اور تدریسی خانوادے کے عظیم فرد تھے بلکہ ان کی ذاتی زندگی بھی انہیں مشاغل سے سرتاسر عبارت رہی۔ وہ استاد ہی نہیں استادگر شخصیت کے

(صبح کی آمد، جیسی) نظموں میں تازگی و معصومیت وہی ہے جو نوخیز پودوں اور کم عمر بچوں میں ہوتی ہے۔ یہ معصوم تازگی موثر ضرور ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو ان کے معاصرین کو میسر نہیں......(اُن کے) یہاں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قافئے استعمال نہیں کئے گئے ہیں، لیکن اس کمی کی وجہ سے ترنم میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔''

اسماعیل میرٹھی کا یہ خاص وصف ہے کہ انہوں نے ہر حال میں بچوں کا خیال رکھا ہے۔ اُن کی ایک خوبصورت غزل ہے جس میں خالق باری کی طرح بچوں کے لئے لغت کا مجموعہ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی ایک غزل دیکھئے جو مومنؔ دہلوی کی مشہور غزل ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کے جواب میں ہے۔

وہی کارواں، وہی قافلہ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزلیں، وہی مرحلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن
اسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی شکر ہے جو سپاس ہے، وہ ملول ہے جو اداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو، ہے گلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی نقص ہے، وہی کھوٹ ہے، وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے، وہی فائدہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی ہے ندی، وہی نہر ہے، وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بلبلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے بھید کہتے ہو راز ہے، جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو، ہے نوا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی خوار ہے جو ذلیل ہے، وہی دوست ہے جو خلیل ہے
بد و نیک کیا ہے، برا بھلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہنے کو تو اسماعیل میرٹھی کی یہ ایک سادہ سی غزل ہے، لیکن بچوں کے لئے تعلیمی اور آموزشی لحاظ سے دیکھیں تو اس کی خصوصیت کچھ ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ یہاں خط کشیدہ لفظوں کی مدد سے مترادف الفاظ یا یوں کہیں کہ لفظ و معنی کی ایک فہرست بنائی جائے تو وہ اٹھارہ لفظوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ذیل میں حروف تہجی کے لحاظ سے اس کی تفصیل دیکھئے:

باجا	=	ساز		شکوہ	=	گلہ
بد	=	برا		ضرب	=	چوٹ
بھید	=	راز		کارواں	=	قافلہ
تان	=	نوا		ملول	=	اُداس
حباب	=	بلبلہ		منزل	=	مرحلہ
خوار	=	ذلیل		موج	=	لہر
دوست	=	خلیل		ندی	=	نہر
سود	=	فائدہ		نقش	=	کھوٹ
شکر	=	سپاس		نیک	=	بھلا

بلاشبہ یہ اسماعیل میرٹھی کے فن کی ایک ایسی جھلک ہے جس کی افادیت اور ضرورت کا پہلو آج بھی بالکل روشن اور تازہ ہے۔ ❁❁

مالک تھے اور تشنگان علم کی پیاس بجھانے میں ان کا کردار ہمیشہ مثالی ہوا کرتا تھا۔ ان کی تدریسی خدمات کا سلسلہ محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول، پٹنہ سیٹی میں جنوری ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اور مئی ۱۹۸۹ء میں بحیثیت پرنسپل یہاں سے سبکدوشی کے بعد بنارس، لکھنؤ اور پٹنہ میں مختلف علمی و ادبی اداروں سے وابستہ رہ کر تصنیف و تالیف کے کام کرتے رہے۔ تدریسی و تبلیغی ضروریات کے لئے انہوں نے تالیفات، تصنیفات، تراجم اور تشریحات کی صورت میں متعدد کتابیں لکھیں اور ''نجف''، ''معلم''، ''شگوفہ''، ''اردو درا'' اور ''الناصر'' کی ادارت و اشاعت کے فرائض انجام دیے۔ رسالہ ''الجواد'' بنارس کی ادارت فرمائی، اسکول میگزین کی داغ بیل رکھی اور ''مگدھ پنچ'' کی اشاعت کے محرک رہے۔ ناصرؔ زیدی کی شاعری کا اشاعتی سلسلہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس سے شروع ہوا جو مختلف اصناف میں ان کی قادر الکلامی کا پتہ دیتا ہے۔ ''ضرب نو'' اور ''راہِ صواب'' کے علاوہ ناصرؔ زیدی کی یادگار نگاری اور خاکہ نگاری کا مجموعہ ''عطر گل'' انشائیوں کا مجموعہ ''شمامہ'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ایک مختصر رسالہ ''گلدستہ بر سرمایۂ نشاط'' بھی اشاعت یافتہ ہے۔ (ماخوذ)

جوہی عشرت

Resear Scholar, Ranchi University Ranchi, At.+P.o.- Kalyanpur
P.s.+Dist- Garhwa - 822114 (Jharkhand) (Mob. 7061615009)

آسماں سے آگے: ایک مطالعہ

''ناول زندگی کی کتاب ہے۔ کتابیں زندگی نہیں، یہ صرف ایتھر میں ارتعاشات ہیں، لیکن ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے زندہ انسان کے اندر لرزش پیدا کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو شاعری، فلسفے، سائنس یا کسی اور کتابی ارتعاش کے بس کی بات نہیں۔'' (ڈی ایچ لارینس)

سطور بالا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ناول زندہ انسان کے اندر لرزش پیدا کردیتا ہے۔ احمد صغیر کا ناول ''آسماں سے آگے'' ایک ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی ناول ہے۔ ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ بنیادی قصہ صنوبر نامی لڑکی اور ایاز شاکر کے اردگرد گھومتا ہے۔ صنوبر ایک دن کی خودساختہ آزادی کی زندگی جینا چاہتی ہے اور گیا کا ساکن ایاز شاکر اردو کا ایک کامیاب کہانی کار ہے جو ممبئی کا سفر ایک ادبی پروگرام میں شامل ہونے کی غرض سے کرتا ہے، جب کہ صنوبر ''اورنگ آباد'' کی ساکنہ ہے اور وہ ممبئی کا سفر سیر وسیاحت کے ارادہ سے کرتی ہے۔ ناول پڑھئے تو ایسا لگتا ہے کہ دونوں نے ایک ہی مقصد سے رخت سفر باندھا ہو۔

اس کہانی کی ہیروئن صنوبر دور حاضر کی آزادی کی چاہ رکھنے والی لڑکیوں کی نمائندگی کررہی ہے۔ وہ خود کو مذہب، معاشرہ اور دیگر تمام جکڑ بندیوں سے آزاد کرلینا چاہتی ہے۔ صنوبر کو گھر کی چہار دیواری کسی قید خانہ سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے اور مزید برآں بات بات پر اس کے والد کی روک ٹوک زنجیر پا کا کام کرتی ہے۔ انہیں وجوہات کی بنا پر صنوبر ایک دن کی ایسی زندگی چاہتی ہے، جس میں وہ ان تمام جکڑ بندیوں کو بالائے طاق رکھ کر جی سکے۔ ایاز شاکر جو کہ اس کہانی کا دوسرا مرکزی کردار ہے، صنوبر کو یہ موقع فراہم کرتا ہے وہ بظاہر پوری کہانی میں صنوبر کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنا رہتا ہے، وہ کہیں بھی اپنا موقف ظاہر نہیں کرتا یا یوں کہئے کہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا، البتہ جب صنوبر اس سے بے تکی بات کرتی ہے تو اس پر وہ خفگی کا اظہار ضرور کرتا ہے، لیکن وہ بھی لفظاً ہی، اس سے آگے اس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، لیکن ذہنی طور پر وہ اس کوفت میں ضرور مبتلا ہوتا ہے کہ آخر میں نے ایسا کیوں کیا؟ یا کیوں ہونے دیا؟ اس حوالے سے ناول کا یہ اقتباس دیکھئے:

''رات گزرتی رہی اور ایاز شاکر کی نیند اس سے روٹھی رہی۔ وہ مسلسل صنوبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ صنوبر نے بلا جھجک اپنے پیار کا اظہار کردیا تھا، لیکن میرے دل میں ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ ہوٹل میں اس طرح مجھ سے لپٹی تھی جیسے کوئی محبوبہ اپنے محبوب سے لپٹی رہتی ہے۔ آخر میں نے اس کے اس انداز پر احتجاج کیوں نہیں کیا؟ میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا، کل ہم دونوں الگ الگ راستے پر گامزن ہوں گے۔ کچھ پل اس کے ساتھ اور سہی۔ یہی سوچ کر خاموش رہا، بہت بیباک لڑکی ہے صنوبر...... یا میں نے اسے بیباک بننے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس نے تو صرف ایک دن مانگا تھا اور میں نے اسے ایک ہفتہ دے دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آخر کیوں؟'' (ناول ''آسماں سے آگے'' ص ۵۲)

ناول کے مرکزی کردار کے علاوہ ضمنی کردار جنہیں بھلانا ممکن نہیں صنوبر کی بھابھی درخشاں اور بھائی عامر حیات ہیں جو کہ ناول میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ دیگر کرداروں میں صنوبر کے والدین اسحاق احمد وسکینہ بیگم، ایاز کی بیوی سعدیہ اور ناول کا اینٹی ہیرو ارمان ہے۔

ناول کے مکالمے فنی اعتبار سے بہت ہی کامیاب ہیں اور

ناول نگار کی مہارت کے شاہد۔ یہ مکالمے گویا قاری کو ناظر کی صف میں لے آتے ہیں اور یوں لگتا ہے، جیسے سب کچھ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر کردار کے مکالمات کردار کی شخصیت اور سوچ پر فٹ بیٹھتے ہیں۔ ایاز شاکر اور صنوبر کے والد صاحب کے مکالمے ملاحظہ کریں:

''میں نے آپ کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں۔ آپ کی کہانی پڑھنے کے بعد لگتا ہے آپ ترقی پسند خیال کے حامی ہیں۔ آپ نے صحیح فرمایا، لیکن مجھے ایسے لوگ پسند نہیں جو مذہب کو افیم سمجھتے ہیں۔ مذہب کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ مذہب جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز بتاتا ہے۔ زندگی میں ایک توازن لاتا ہے۔ ایاز چاہتا تو اس موضوع پر لمبی بحث کر سکتا تھا، لیکن وہ خاموش رہا۔ ایک تو ان سے پہلی ملاقات تھی۔ دوسرے بزرگ تھے اور ان کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا کہ وہ کٹر مذہبی آدمی ہیں پھر بھی اس نے دھیرے سے کہا: ہر آدمی کو اختیار ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنے طریقے سے جیے، چاہے مذہب کی پابندی میں رہ کر یا پابندی کو توڑ کر...... کچھ لوگ مذہبی ہوتے ہوئے بھی وہ سب کر جاتے ہیں جس کی مذہب اجازت نہیں دیتا اور کچھ لوگ غیر مذہبی ہو کر انسانیت کا وہ کام کرتے ہیں جسے کٹر مذہبی بھی نہیں کر پاتے۔ بہر کیف آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

(آسماں سے آگے، ص ۱۰۶)

آج کی نسل جس طرح سے انگریزی زبان کا استعمال اردو کے ساتھ مخلوط کر کے بولتی ہے یہ ناول اس کا بہترین ترجمان ہے۔ اس ناول کے لکھنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ والدین کے ذریعہ مذہب کے نام پر جب بچوں کے جذبات، ان کے نفسیات، ان کی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، تب صنوبر جیسے کردار پنپتے ہیں، جس طرح صنوبر اپنی خواہشات کو کسی غیر محرم کے ساتھ ساجھا کرنے کو تیار رہتی ہے وہ اس پر مذہبی بندشوں و پابندیاں لگانے کی وجہ سے ہی ہے، اگر اس کے خواہشات کا خیال رکھا جاتا تو شاید وہ اس طرح بیباک نہیں بنتی۔ صنوبر کی بیباکی کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''ایاز صاحب آپ ایک بڑے فنکار ہیں۔ دنیا جہان کی باتیں جانتے ہیں۔ اس کے باوجود میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ نہ جانے کیوں لوگ عورت کو ننگا دیکھ کر اتنا حیران ہوتے ہیں، جب کہ دنیا کے کئی شہروں میں بارہ مارچ کے دن ورلڈ نیوڈ سائیکل پریڈ ہوتی ہے اور عورت اور مرد بغیر کپڑوں کے اس پریڈ میں حصہ لیتے ہیں۔ جاپان کے شہر ٹوکیو میں کئی مقامات پر ایسے ہاٹ اسپرنگ بنے ہوئے ہیں......انڈونیشیا کے بالی میں ایک ایسا اسپاٹ ہے جہاں آپ کو بیوٹی ٹریٹمنٹ کے ساتھ ساتھ بغیر کسی روک ٹوک کے عریاں گھومنے دیا جا سکتا ہے۔ فن لینڈ کے ہل سنکی میں سونا باتھ ایک ایسی جگہ ہے جہاں لوگ عریاں ہو کر گھومتے ہیں اور سر عام سب عریاں ہو کر مساج بھی کرواتے ہیں۔ اسٹریلیا میں نیوڈ آرٹ فیسٹیول ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر لوگ اپنے عریاں جسم پر مصوری کرواتے ہیں۔'' (آسماں سے آگے، ص ۱۸۸)

کوئی بھی انسان کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو پر بات جب بہن کی ہوتی ہے تو وہ اسے روک ٹوک کے ساتھ پھٹکار بھی لگاتا ہے، صنوبر کے بھائی کو بھی جب اس کی محبت کا پتا چلتا ہے تو وہ کہتا ہے:

''صنوبر پاگل نہ بنئے......آپ آگ میں کود پڑی ہیں۔ جھلس جائیں گی۔ آپ کا پورا وجود جھلس جائے گا۔ آپ کہیں کی نہیں رہیں گی، کیوں کہ ایاز شاکر آپ سے کبھی شادی نہیں کریں گے پھر ایسی محبت کا کیا حاصل؟''

اور پھر بھائی کی بات کا جواب وہ اس طرح دیتی ہے:

''بھائی جان ہر محبت کا انجام وصال نہیں ہوتا، جدائی بھی ہوتی ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ محبت کا آغاز ایک طرفہ ہے پھر مجھے جدائی کا خوف کیسا؟ میں ان کی یادوں کے سہارے جی لوں گی۔'' (آسماں سے آگے ص ۸۷)

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا اس طرح کی جنونیت کوئی بھی بھائی برداشت

کرے گا؟ ناول کا ٹرننگ پوائنٹ ایک اینٹی کردار ارمان کے آنے کے بعد سامنے آتا ہے۔ صنوبر جب ممبئی میں اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیتی ہے تو وہاں فیشن ڈیزائنر بن جاتی ہے اور کئی کانٹریکٹ اسے ملتے رہتے ہیں۔ اسی دوران ارمان کی انٹری ناول میں ہوتی ہے، جو صنوبر کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اس کے حسن کا دیوانہ بن جاتا ہے۔ وہ صنوبر کو پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، مگر صنوبر ایاز کے علاوہ کسی کو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُسے ایاز کی شادی اور بچوں کا پتا چلتا ہے، پھر بھی وہ ایاز سے پہلے ہی کی طرح محبت کرتی ہے، لیکن ارمان بار بار منع کرنے کے باوجود بھی صنوبر کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں کبھی وہ صنوبر کے گھر تک پہنچ کر اسے ڈراتا تو کبھی گھر پر بیک وقت آ پہنچتا اور حد تو تب کرتا ہے جب وہ شادی کا کارڈ تک چھپوا کر صنوبر کو بھیجتا ہے ''ارمان وڈس صنوبر''۔ ایسے میں ایاز شاکر صنوبر کی کسی عاشق کی طرح مدد کرتا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی صنوبر کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔ انہیں وجوہات کی بنا پر ایاز کا کردار پختہ بنتا ہے۔

یہ ناول ہمیں کہیں نہ کہیں مصنف کی خود نوشت کا پتا دیتا ہے۔ احمد صغیر کو ہم ایاز شاکر کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسی لڑکی کی ترجمانی کرتا ہے جو محبت تو کرتی ہے، مگر شادی کر کے اسے مکمل نہیں کرنا چاہتی اور اس طرح سے قاری کے ذہن میں کئی سوالات ابھر کر آتے ہیں، مثلاً یہ کہ صنوبر ایاز کے ساتھ شادی سے انکار کیوں کرتی ہے؟ کیا وہ پھر سے مذہبی رنگ میں رنگنا نہیں چاہتی تھی؟ یا پھر ایاز شادی شدہ تھا اور صنوبر اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی؟ یا پھر بار بار انکار سے اور اپنے جسم کو عریاں کر کے ایاز اور اس کی محبت کو آزمانا چاہتی تھی؟ دوسری طرف ایاز کی بیوی کو جب صنوبر کی محبت کی جنونیت کا پتہ چلتا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شادی کی اجازت دے دیتی ہے آخر کیوں؟ صنوبر کی غیر مناسب حرکت اور ایاز کا یوں بت بنے رہنا کیا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایاز بھی صنوبر سے اتنا ہی پیار کرتا ہے جتنا یہ چاہتی ہے اور جیسے ہی وہ اقرار محبت کرتا ہے صنوبر یوٹرن لے لیتی ہے۔

ایاز شاکر کے اس جرأت مندانہ عمل پر صنوبر کا یہ غیر متوقع ردعمل نہ صرف ایاز شاکر بلکہ قاری کو بھی متحیر کر دینے کے لیئے کافی ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ ایاز شاکر کے اقرار اور صنوبر کے انکار کے بعد سے ناول میں گھوم رہی وہ دو علامتی آنکھیں بھی غائب ہو جاتی ہیں، جو صنوبر کو ہر بار غلط کرتے وقت گھورتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ گویا کہ ایاز شاکر کا ارادہ جان لینے کے بعد صنوبر کا احساس جرم ختم ہو گیا تھا۔ اس سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے، اوّل یہ کہ ایک لڑکی چاہے کتنی ہی بیباک کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو جائے، لیکن اسے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ کس راہ کو اختیار کر رہی ہے۔ دوم صنوبر کا ایک نفسیاتی پہلو سامنے آتا ہے بظاہر وہ ایاز کے پرپوزل کو ٹھکرا دیتی ہے، لیکن اسے اپنے وجود میں ایک اطمینان محسوس ہوتا ہے اور ایک طرح سے وہ اپنی محبت کو حاصل نہ کرنے کے باوجود مکمل ہو جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ بھی احمد صغیر کا ناول ''آسماں سے آگے'' اپنے جملہ صفات سے متعلق ایک عمدہ ناول ہے، جب کہ ناول کا اختتام ایک سوالیہ نشان بن کے رہ جاتا ہے۔

یہ ناول یوں بھی منفرد ہے کہ محبت کی داستانوں میں جنونیت اکثر ہمیں لڑکوں میں دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن اس ناول میں صنوبر ہر مرحلہ پر بیباکانہ، باغیانہ اور جنونی انداز میں پہل کرتے دکھائی دیتی ہے۔ محبت کی تپش، آسماں سے آگے جانے کی خواہش، ان سبھی لوازمات سے پر ہونے کی چاہت، اس کے دل میں جل رہی آگ، اس کے لبوں سے نکل رہے شعلے، صنوبر کا اس کے والدین و بھائی بھاوج کے ساتھ رویہ، اس کے باغی ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں جو لڑکی اپنے باپ کے سامنے سر نہیں اٹھاتی تھی آج وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کر رہی تھی، تن تنہا۔ اس کی نفسیات حیران کن ہے، اس کی خواہشات آج کل کے مغربی ٹرینڈ "Live in relationship" کی تائید کرتی ہیں۔ ❁❁

تصحیح و اعتذار

''زبان وادب''، ستمبر ۲۰۲۴ء کے شمارے میں صفحہ ۵۹ کی غزل (آپ کے دل سے ملے دل تو کوئی بات بنے) کے ساتھ شاعر محترم کا نام غلط چھپ گیا ہے۔ ان کا صحیح نام ''غیاث انور شہودی'' ہے۔ قارئین کرام ازراہ مہربانی نوٹ فرمالیں۔ ہم اس سہو کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

افسانے

فرزانہ اسد
30, Gulistan Colony, Police Line Takli, Nagpur - 440013 (Mob. 9579591149)

چوتھی بیٹی

''حیدر صاحب کی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔''

ایسا محسوس ہوا جیسی کچن میں کوئی شیشے کی برنی ریک کے بالائی خانے سے فرش پر گر کر چور چور ہو گئی ہو۔ اس قسم کے کسی واقعے کے بعد جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے، وہ یہ کہ آخر کون سی برنی ٹوٹی؟ کچھ اسی قسم کا سوال میرے ذہن میں بھی اُبھرا۔ حیدر صاحب کی تین چار لڑکیاں تھیں، شاید تین ہی تھیں۔ پڑوس کے اس شخص سے جس نے یہ غم ناک خبر دی تھی، میں نے پوچھا:

''ان کی کون سی بیٹی کا انتقال ہوا ہے؟''

مگر وہ جنازے میں شریک ہونے کے باوجود نہیں بتا سکا۔

چند سال پہلے ہم لوگ حیدر صاحب کے گھر کرائے دار کی حیثیت سے رہ چکے تھے، تقریباً چھ مہینوں تک۔ اس دوران حیدر صاحب اور ان کے بچے بھی بس لیے دیئے ہی رہتے تھے۔ نہ جانے وہ لوگ ہی کچھ سرمہری کا شکار تھے یا بے مروتی اس گھر کا حصہ تھی۔ جب ہم نے وہ گھر چھوڑا تو جو انسیت عام طور پر در و دیوار سے ہو جایا کرتی ہے، ہمیں قطعی محسوس نہیں ہوئی، جس کمرے میں ہم رہتے تھے وہاں عجیب سی گھٹن تھی۔ ہمیشہ اندھیرا سا رہتا تھا۔ خدا جانے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں صرف چھوٹی چھوٹی سی تین کھڑکیاں تھیں یا اس گھٹن کا سلسلہ اس مکان میں رہنے والوں سے جڑا ہوا تھا، کیونکہ آج بھی جب میں حیدر صاحب اور ان کی بیگم کو بازار میں اسکوٹر پر سوار گزرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے، میں اُسی گھٹن بھرے ماحول میں گھر گئی ہوں۔

مکان کرائے پر لینے کے وقت ان لوگوں نے ہمارے رشتے داروں کے بارے میں کافی پوچھ تاچھ کی تھی، مگر ہم نے انھیں کچھ کھل کر بتایا نہیں تھا۔ مکان میں سامان وغیرہ رکھنے کے بعد حیدر صاحب کی بیگم نے اندر آ کر مختلف کمروں کے بارے میں تفصیلات بتائیں، پانی اور اس کی نکاسی کے راستے کے بارے میں چند ہدایتیں دیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا، جیسے ان کا اور ہمارا تعلق ختم ہو گیا ہو۔

سامان وغیرہ ترتیب دینے کے بعد تھکن جیسے مجھ پر آ گری، شدید پیاس محسوس ہونے لگی تھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ہمارے پاس پینے کا پانی نہیں ہے۔ آخر مجھے ان کا دروازہ کھٹکھٹا کر پانی مانگنا پڑا۔ اتفاق سے وہ گرمیوں کے دن تھے۔ ''نل نہیں آیا؟ ابھی آتا ہوگا، خیر لے لیجئے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے پانی کا جگ میرے حوالے کر دیا۔ ان کا لہجہ سرد تھا اور پانی گرم۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کرایہ دار اپنی حد سے باہر آئیں۔ ان کے بچے بھی آتے جاتے نظریں جھکائے رہتے تاکہ سلام کے مواقع ٹالے جاسکیں۔

ان کے گھر میں گزارے ہوئے وہ چند ماہ ہمارے لیے مشکلات سے پر تھے۔ اتنے بڑے گھر میں خاموشی اور تنہائی کا راج تھا۔ حیدر صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ اکثر گھر سے باہر رہتے تھے۔ گھر میں ماں اور بیٹیاں یا تو نماز پڑھتی ہوئی نظر آتیں یا ٹی وی دیکھتے ہوئے۔

ان ہی دنوں جب میرا چھوٹا بھائی راشد چند دنوں کے لیے ہمارے گھر آیا تو حیدر صاحب کا دروازہ جو اکثر بند رہتا تھا، تھوڑا سا کھلا۔ نہ جانے وہ دروازہ تھا یا مسز حیدر جو دروازے ہی کی طرح وا ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اکثر یہ ہونے لگا کہ کبھی کپڑے الگنی پر ڈالتے ہوئے یا پودوں کو پانی دیتے ہوئے وہ رک کر بات کرنے کے بہانے تلاش کرنے لگیں۔ اسی دوران انھوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کے بارے میں مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔ ان کی بڑی بیٹی صبیحہ مقامی کالج میں بی ایڈ کر رہی تھی۔ اس سے چھوٹی سیما جونیئر کالج میں تھی اور تیسری بیٹی انجم ہائی اسکول کی طالبہ تھی۔ وہ لڑکی مجھے کسی قدر اچھی لگی۔ آتے جاتے نظر آ جاتی تو مسکرا کر ''السلام علیکم آنٹی'' کہتی۔ کیسی صاف و شفاف مسکراہٹ تھی، مگر اس کے

آ گے جیسے لکشمن ریکھا کھینچ دی گئی ہو۔

ان تینوں لڑکیوں کے علاوہ میں نے دیکھا کہ گھر میں ایک لڑکی اور بھی تھی جو اکثر میلے کچیلے کپڑے پہنے گھر کے کاموں میں مشغول رہتی تھی ۔ پہلے تو میں یہ سمجھی، وہ کوئی نوکرانی ہے، مگر ایک دن جب وہ پانی لینے آنگن میں نل کے قریب آئی تو میں نے اسے غور سے دیکھا۔اس کا مہاسوں سے اٹا ہوا چہرہ بالکل اسی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا جس سے حیدر صاحب کی دوسری لڑکیاں نکلی تھیں۔

اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی بے چینی اور سراسیمگی تھی جس سے دوسری لڑکیوں کے چہرے عاری تھے۔ وہ ان سب سے زیادہ نحیف اور کمزور بھی تھی ۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہی تھا۔ چہرے کو بغور دیکھنے سے لگتا تھا کہ وہ ان سب سے بڑی ہے۔

ان کے گھر ایک کام کرنے والی بائی بھی آیا کرتی تھی، نام تھا اس کا شکنتلا۔ میں نے سوچا کہ اس سے اپنے گھر کے کاموں کے لیے بھی بات کرلوں ۔ جب میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اتفاق سے مسز حیدر کا اسی وقت اُدھر سے گزر ہوا۔انھوں نے دیکھ لیا۔ انھوں نے فوراً اسے کسی کام کے نہ کرنے پر ڈانٹا۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ انھیں میرا اس سے بات کرنا پسند نہیں۔ گویا وہ نہیں چاہتیں کہ میں کام والی بائی کے ذریعے ان کے گھر کے اندر تک پہنچ جاؤں۔

ایک دن اتفاقاً آنگن میں مسز حیدر سے میری ملاقات ہوگئی۔ ہم بات کررہے تھے کہ اسی دوران وہ لڑکی آنگن میں آ گئی:

''وہ......وہ...... پانی ختم......'' وہ ہکلائی۔

''اچھا اچھا...... جاؤ میں آتی ہوں۔'' مسز حیدر کے لہجے میں عجیب سی کڑواہٹ اور گھبراہٹ تھی۔

''یہ کون ہے......؟'' میں نے پوچھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا سوال انھیں بجلی کے جھٹکے کی طرح محسوس ہوا ہے۔ وہ فوراً ''ابھی آتی ہوں'' کہہ کر اندر چلی گئیں۔ میں نے کچھ دیر ان کا انتظار کیا، مگر وہ نہیں آئیں، میں بھی اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

چند دنوں بعد میں اپنے گھر آئی ہوئی مہمان خواتین کے ساتھ مسز حیدر کے گھر گئی۔ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔لڑکیوں نے چائے اور دیگر لوازمات سے تواضع کی، مگر وہ چوتھی لڑکی کہیں نظر نہ آئی تو میں نے اس کے متعلق پوچھ لیا، مگر، مسز حیدر بڑی خوبصورتی سے وہ بات گول کرگئیں۔

شاید وہ مئی کا مہینہ تھا اور اس دن مردم شماری کرنے والے لوگ آئے ہوئے تھے۔ہم نے اپنے نام اور تفصیلات لکھوادیا۔اس کے بعد مسز حیدر آگے بڑھیں۔ جب میں وہاں سے جانے لگی تو ایک جملہ میرے کانوں میں پڑا:

''ہاں ہاں، تین ہی بیٹیاں ہیں ہماری۔''

پھر میں نے اپنی پڑوسن جمیلہ سے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی:

''ہے تو وہ ان ہی کی لڑکی، دیکھا نہیں آپ نے، چہرے کے نقوش بالکل ماں جیسے ہی ہیں، مگر سنا ہے وہ کچھ ابنارمل ہے اسی لیے وہ اسے کبھی سامنے نہیں لاتے۔''

''مگر کیوں وہ خون تو ان کا اپنا ہے۔''

''کیا بتائیں جی......لڑکیاں ماں باپ کی عجیب سی مجبوری ہوا کرتی ہیں۔''

''ایسی بھی کیا مجبوری؟''

''مجھے لگتا ہے وہ اس لڑکی کو شاید اس لیے چھپا کر رکھتے ہیں کہ کہیں دوسری لڑکیوں کے آنے والے رشتے بھی نہ رک جائیں۔ کوئی اور بات ہو تو خدا جانے ...... وہ لڑکی اکثر بیمار رہتی ہے، سنا ہے اسے دورے بھی پڑتے ہیں۔''

چند ماہ بعد ہم نے حیدر صاحب کا مکان چھوڑ دیا۔اس کے بعد کبھی ان کے ہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جس وقت ہم نے مکان خالی کیا، کرایہ اور بجلی کے بل کے متعلق کافی لے دے ہوئی اور تلخیاں اس قدر بڑھیں کہ اس کے بعد اس محلے میں جب کبھی میرا گزر ہوتا تو ان کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے قدم من من بھر کے ہوجاتے، مگر آج تو ان کے گھر جانا ہی تھا۔

معلوم نہیں، ان لڑکیوں میں سے کس کا انتقال ہوا تھا......؟ آخر کیا ہوا؟ بہر حال ان کے یہاں جانا اور تعزیت کرنا تو ضروری تھا۔

(بقیہ ص ۵۴ پر)

ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی
H.No.1/A,BL.No.23, Kela Bagan,Jagatdal,North 24 Parganas - 743125 (Mob. 9339327323)

خاموش صدا

یادوں کی دہلیز پر جب لوبان سلگتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ خانہ بدوشوں کے مقدر میں اب شیش محل نہیں ہے۔ پریشان ہو کر بردھا آشرم کی کھاٹ پر پڑا ہوا بوڑھا اکثر کہا کرتا ہے:

''اے میرے پروردگار تو کوئی ایسی صورت نکال کہ ہم تیری دی ہوئی نعمت سے محظوظ ہو سکیں۔ نہ اب ہمیں چاند میسر ہے، نہ اس کی چاندنی۔ نہ اب ہم بیساکھ میں آدم صورت دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی صبح کے تارے۔ لہلہاتی ہریالی کو دیکھے تو ایک زمانہ گزر گیا۔''

اس بوڑھے کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ وہ لمحہ جلد آنے والا ہے جب لوگ اس کی قبر پر مٹی ڈالنا کارِ ثواب سمجھیں گے۔ اب رات رات بھر اپنی کھاٹ پر پڑے ہوئے وہ یہی سوچتا رہتا۔

ایک وہ زمانہ تھا جب میت ہونے کی خبر پھیلتے ہی فوراً اڑوس پڑوس کے جلتے چولہے کھورنی سے کھور کھور کر گرا دیئے جاتے اور تب تک چولہے نہیں جلائے جاتے جب تک دروازے سے میت نہیں اُٹھ جاتی۔ سر جھکائے سب کے سب میت کے پیچھے چلتے۔

آگے آگے ایک چھوٹا بچہ مٹی کی لوبان دانی میں سلگتے ہوئے لوبان لے کر چلتا جس کی خوشبو سے پیچھے چلنے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری رہتی۔ جیسے ہی میت سنسان راستے سے ہوتے ہوئے قبرستان پہنچتی، چلچلاتی دھوپ میں سڑک کے دونوں کنارے کوئلہ چننے والی عورتیں احتراماً کھڑی ہو جاتیں اور غیر مسلم راہ گیر چپل کھول کر عقیدت سے دونوں ہاتھ جوڑ لیتے۔

منزل پر پہنچ کر جنازہ گھر میں طاق پر لوبان دانی رکھ دی جاتی اور نماز ختم ہوتے ہی میت میں آئے چھوٹے بچے درمے اور بانس کو قبر تک لے جانے کے لیے آپس میں لڑ پڑتے۔

جنازہ وہاں سے اُٹھتا۔ سب لوگ سر جھکائے قبرستان میں اس طرح داخل ہوتے مانو جنت البقیع میں داخل ہو رہے ہوں۔

جنازہ سیدھے کھدی قبر پر پہنچتا۔ سب لوگ قبر کے چاروں طرف یوں خاموش کھڑے رہتے کہ ہوا کی سرسراہٹ سنائی دیتی۔ تکیہ دار قبر میں اُترتا، اس کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے یہی منکر نکیر ہیں۔

میت دفن کر کے جب تک قبر پر کورے مٹی کے گھڑے سے پاس کے کنویں کا ٹھنڈا پانی ڈال کر دعا کے لیے اُٹھے ہاتھ، نیچے نہیں گرتے، ایک بھی آدمی وہاں سے نہیں ہلتا۔ ایک شخص اونچی آواز لگاتا:

''ایک ضروری اعلان سنیں ـــــ کل مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے ان کے مکان پر قران خوانی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ آپ اس میں شرکت کریں اور دعائے مغفرت میں حصہ لیں۔''

چالیس قدم ہٹنے کے بعد سب کی زبان پر اس کا ذکر ہوتا:

''قبر میں حساب وکتاب شروع ہو گیا ہوگا...... فرشتے قبر میں آ گئے ہوں گے۔!''

خوف کا غلبہ طاری ہو جاتا۔ اسی خوف کے سائے میں لوگ جنازہ گھر کے پاس واپس آتے جہاں تکیہ دار اور مسکینوں کے سفید سفید کپڑے کے ٹکڑے پر چاول، مسور کی دال اور چند سکے ڈال کر سب لوگ ایک ساتھ اہل میت کے گھر جاتے جہاں پہلے سے تیار کیا گیا چینی کے شربت کا ایک ایک گلاس پی کر چپ چاپ ایسے اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے جیسے میت انہیں کے گھر ہوئی ہو۔

مگر اب......تو زمانہ نے یوں کروٹ لیا ہے کہ قبرستان کے سامنے کفن فروش کی دکان نہیں ہے، لیکن شادی بیاہ کے لیے پلنگ، الماری، گدے، تو شک تکیہ، سنگار دان دھڑلے سے فروخت ہو رہے ہیں۔ چائے پان کی دکان پر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ جیسے ہی مٹی گرنے کی آواز آتی

ہے،لوگ دوڑے دوڑے آتے ہیں اور پھر......تین مٹھی مٹی کا قرض چکایا، ہاتھ اوپر کئے اور سیدھے وضو خانے کی طرف چل دیئے...... ہاتھ دھویا، باہر نکل گئے......پھر چائے کی پیالی خالی کی......اسکوٹر یا آٹو رکشا پر بیٹھے اور سیدھے اپنے اپنے گھر کو واپس آ گئے۔ باقی ساری ذمہ داری گھر والے خود نبھا لیتے ہیں۔

کبھی کبھی نیم غنودگی کی حالت میں یہ بوڑھا بڑبڑانے لگتا:

''یہ تیرا پاگل پن ہے رے کہ تو سمجھتا ہے کہ تیرے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ جہاں تو گیا ہے نا وہ تیرے تھوڑے ہوں گے۔ وقت گزرنے دے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔ گھبرامت، سورج غروب ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے......''اس کی بڑبڑاہٹ سن کر کھانستے ہوئے بغل کا ساتھی بول اٹھتا:

''کمپیوٹر پر مبنی آج کی ذہانت مصنوعی ہے۔ وہ قدرتی ذہانت کی متبادل نہیں ہوسکتی، اس لیے سنگین مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔''

کھیوا گھاٹ سے اُتر کر داہنے طرف جو سڑک جاتی ہے، اس کے کنارے بائیں جانب وہ بوسیدہ عمارت ہے جس میں کبھی یہ بوڑھا رہتا تھا۔ اب زمانہ آگے بڑھ گیا ہے، اس کے بیٹے اور بہو برمنگھم میں گرین کارڈ ہولڈر ہو گئے ہیں۔

اس پشتینی مکان کے پلاسٹر جہاں تہاں سے جھڑ گئے ہیں۔ لوہے کا گیٹ ہمیشہ ادھ کھلا رہتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی مکان میں آیا ہے یا ابھی ابھی کوئی گیا ہے۔ اس مکان کی دیکھ ریکھ کرنے والوں کے چہرے اور لباس عمارت کی حالت سے مشابہت رکھتے ہیں۔ دو دن قبل اس بوڑھے نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

''تم اس عمارت کے حقیقی وارث ہو۔ اگر تم اس کی حفاظت نہ کرسکے تو یاد رکھنا اس عمارت کی ایک ایک اینٹ تم کو بددعا دے گی، اس لئے کہ یہ ساری اینٹیں محنت و مشقت اور قربانیوں کے خون سے سیراب ہوکر یکجا ہوئی ہیں اور تم یہ بھی یقین جانو ایسی بے جان چیزوں کی صدائیں زمیں زادے نہیں، زمیں زادوں کا خالق سنتا ہے۔''

اور بیٹے نے غالباً فون کاٹ دیا تھا۔

بڑے بزرگ بتاتے ہیں کہ پرانے زمانے میں پہلے یہاں فرانسیسیوں کی ایک بڑی کالونی تھی۔ فرنگیوں کے جانے کے پانچ برسوں بعد جب فرانسیسی بھی یہاں سے رخصت ہوگئے، تب ان کے ترکے کو ہیریٹیج بنا دیا گیا۔

یہ بوڑھا ایک دن کہہ رہا تھا کہ جب اس کی بیوی حیات میں تھی، اس کا اکلوتا بیٹا جوان دنوں برمنگھم میں گرین کارڈ ہولڈر ہے، شکایتی لہجے میں کہتا تھا:

''بورڈنگ اور ہاسٹل کے زمانے میں تم اور پپا نے میرے خرچ اُٹھائے۔ دفتر میں تم دونوں کی زندگی اتنی مصروف تھی کہ سال میں ایک دو دفعہ ملنے چلے آتے وہ بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے......ایسے دنوں میں جب میں تنہائی کا شکار تھا۔ اس نے ہی میری تنہائی کو دور کیا۔ آج اس کے ساتھ میں ہوں تو کیا برا کرتا ہوں؟''اس کی گفتگو سے ایسا لگتا جیسے وہ کہنا چاہتا ہے:

''میں نے بھی تم دونوں کو زندگی گزارنے کی فیکٹری میں داخلہ دلا دیا ہے، جہاں قیام و طعام کے ساتھ ساتھ زندگی کی سب آسائشیں میسر ہیں۔ موہ مایا یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ یہ سب ڈھکوسلے چھوڑو۔ زندگی ایک دم میکانیکل ہوگئی ہے۔ تم نے مجھے آدمی بنانے کی فیکٹری میں بھیجا، میں وہاں آدمی بن گیا۔ اب اگر مجھ میں کچھ خامی پیدا ہوگئی تو یہ میرا نہیں اس آدمی بنانے والی فیکٹری کا قصور ہے اور تھوڑا بہت تمہارا بھی کہ ایسی فیکٹری کا انتخاب تم نے کیوں کیا......؟ تمہیں اسی بات کا دکھ ہے نا کہ میں نے ارپیتا سے شادی کیوں کی؟ تو سنو! جن دنوں گنبد گرے، مشترکہ قومیت میں دراڑ آئی۔ ان دنوں میں اکیلے ہاسٹل میں تھا۔ باہر وہ رات بہت بھیانک تھی جب سوٹ ایٹ سائٹ کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد ہاسٹل کی فضا بھی مسموم ہوئی، مگر میں مشکل کی اس گھڑی میں اس لیے نہیں گھبرایا کہ معجزے اکثر مشکلوں میں ہی ہوتے ہیں۔ ان دنوں تقدیر کے کوفہ سے روز گزرنا پڑا۔ ابتلا و آزمائش کے اس دور میں بھی مشترکہ قومیت کے وارث ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس کی حفاظت کی کوشش کرتے رہے۔ ان ہی میں سے ارپیتا مہتہ بھی ایک ہے جو اس وقت میری کلاس فیلو تھی۔ وہ ہاسٹل میں سب جگہ کہتی پھر رہی تھی کہ زندگی یوں ہی بہت تلخ ہے اس میں اپنے حصے کا زہر نہ ملائیں۔

چلو ماضی کی یادوں کے دریچے کھولتے ہیں کہ اندر کا حبس ختم ہو......اس کی آنکھیں ناگن کی تھیں جس نے زندگی کے اس سنگین موڑ پر آئے فرشتوں کے ساتھ ساتھ راون اور ابوجہل کے چہروں کے عکس کو بھی محفوظ رکھا۔ صرف اور صرف اس کی وجہ سے میرے اندر بے موسم کے ابیر وگلال اڑے،تنہائی کی تاریکی میں دیئے جلے۔اس کی ماں اس کی باتوں کو سن کر ہکابکا اس کا منھ تکا کرتی تھی۔موٹے کمبل کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس بوڑھے کے ساتھی نے کہا:''جانتے ہو پرمیشور......! آج میں نے میڈیکل والے سے جا کر کہا ہے۔''

بوڑھے نے کھانستے ہوئے پوچھا:''کیا کہا ہے......؟''

''یہی کہ بابوتم ایم پی صاحب سے کہہ کر دواسستی کروادو۔''

پرمیشور نے پوچھا:

''آپ نے میڈیکل والے سے ایسا کیوں کہا؟''

بوڑھے نے تیز رفتار سلنگ فین کو تکتے ہوئے کہا۔

''اس لئے کہ بیٹے سے پیسہ مانگنے میں شرم آتی ہے۔''

پرمیشور نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوسری کروٹ لیتے ہوئے کہا:

''ترقی کے اس دور میں جو نسل پاندان سے ناواقف ہو،وہ خاندان کا مطلب کیا سمجھے گی؟رشتوں کا شجر تو کب کا مرجھا چکا ہے۔ اس کی جڑوں میں میں نے بھی پانی ڈالا،لیکن پتے ہرے نہیں ہوئے۔''

''یہاں تمہیں دکھ کس بات کا ہے؟''

''یہی کہ جو اپنوں کو کرنا چاہئے تھا وہ ان لوگوں نے کیا اور ابھی بھی کرتے ہیں جن کے لیے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔''اس گفتگو کے بعد رفتہ رفتہ ہال خاموشیوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔

گھڑی میں رات کے دو بج رہے ہیں۔صرف پنکھے چلنے کی آواز آرہی ہے۔بلب کے نیم اُجالے میں اس ہال نما کمرے میں جہاں دونوں طرف اسٹیل کے بیڈ لگے ہوئے ہیں،رات کی ڈیوٹی دیتے ہوئے اس خاموش صدا کو سن کر ایسا لگتا ہے جیسے وردھا آشرم ایک عجائب گھر ہے جہاں ہر بیڈ پر سفید سفید غلاف کے اوپر حنوط شدہ زندہ لاشیں رکھی ہوئی ہیں اور ہر لاش سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے یہی سوچتی ہے کہ:

''خانہ بدوشوں کے مقدر میں اب شیش محل نہیں ہے۔!'' ❁❁

جدید افسانے پر ایک نظر

(ص ۲۳ سے آگے)

ہے چونکہ مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ جدید افسانہ جس زینے پر سے ہو کر بلندی کی اس اٹاری تک پہنچا ہے،وہ زینہ پریم چند سے لے کر کرشن چندر تک کے افسانوں ہی کا تعمیر کردہ ہے،البتہ یہ ضروری ہے کہ افسانہ نگار اپنے افسانے میں وہ قوت ضرور پیدا کرے جس سے قاری افسانے کی گرفت میں آجائے۔کھلی ہوئی بات ہے کہ عام قاری بے سر پیر کے افسانے سے نہ مسرور ہوسکتا ہے،نہ مستفید ہوسکتا ہے۔قاری کی سمجھ میں آنا چاہئے کہ افسانے میں اس کے خالق نے کہنا کیا چاہا ہے۔یہ ضروری نہیں کہ ہر افسانے میں معاشرے کو آئینہ دکھانے کی صلاحیت ہو،لیکن اس میں جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے،وہ تو قاری کو اپنے ذہن میں سانس لیتا ہوا محسوس ہونا ہی چاہئے۔ ❁❁

چوتھی بیٹی

(ص ۵۱ سے آگے)

ان کا گھر ہمارے گھر سے کوئی دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

چلتے چلتے بس اسٹاپ کے قریب میں نے دیکھا،حیدر صاحب اپنی اس لڑکی سیما کو جو کالج میں پڑھتی تھی اسکوٹر پر بٹھائے ہوئے گزر رہے تھے۔ سیما کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر بے چینی کی کچھ لہریں جو اس خبر کو سن کر ابھر رہی تھیں،اچانک تھم گئیں۔

میں کچھ اور آگے بڑھی،حیدر صاحب کا گھر قریب ہی تھا۔ میری رفتار دھیمی پڑنے لگی اور جب گھر کے قریب پہنچی اور گیٹ پر نظر پڑی تو اچانک جیسے زمین نے میرے پیروں کو پکڑ لیا۔حیدر صاحب کی بڑی بیٹی صبیحہ جو بی ایڈ کر رہی تھی اور سب سے چھوٹی بیٹی انجم جو ہائی اسکول کی طالبہ تھی،کتابیں ہاتھ میں لیے گیٹ کھول کر باہر نکل رہی تھیں۔

میں وہاں کھڑی بہت دیر تک یہی سوچتی رہی کہ اب میں کس کی تعزیت کروں؟اس لڑکی کی جو وہاں تھی ہی نہیں،جسے انھوں نے ہم سے اور سارے زمانے سے چھپا کر رکھا تھا۔کہیں وہ اس کے وجود ہی سے انکار نہ کردیں،کیا اس سے متعلق وہ میری تعزیت قبول کریں گی؟

❁❁❁

منظومات

فردوسؔ گیاوی
Arif Nagar, Gewal Bigha, Gaya - 823001
(Mob.-9546037777)

ایک مسکراہٹ

مجھ کو بھی پریشان
گردشِ ایام نے کر رکھا ہے
گھرے ہو تم بھی
مسائل کے گھنیرے جنگل میں
تم بھی مغموم بہت رہتے ہو
ایک عرصے سے
میرے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہے
یعنی ایک سا درد ہے ہم دونوں کا
تو کیوں نہ ہم آپس میں بانٹ لیں
ایک دوجے کا غم اور خوشیاں
تم میری بچی ہوئی ہنسی لے لو
اور اپنا سارا غم
ڈال دو میری جھولی میں
اُتار پھینکو اپنے بدن سے
یہ اُداسی کی دبیز چادر
کیوں کہ تم
جب اُداس ہوتے ہو
تو ٹھہر سی جاتی ہے یہ کائنات
اُداس ہو جاتی ہیں یہ فضائیں
اُداس ہو جاتے ہیں یہ پرندے
اور اُداس ہو جاتا ہے میرا دل
دیکھو یہ پرندے
اپنے پروں کو سمیٹے
بیٹھے ہوئے ہیں پیڑوں پر
تم جو مسکرا دو
تو یہ فضائیں کھلکھلا اُٹھیں
پرندے چہچہا کر اُڑان بھرنے لگیں
اور میرا دل بھی
کھل اُٹھے ایک تازہ گلاب کی مانند
اور کائنات
اُداسی کے خول سے نکل کر
رواں دواں ہو جائے
سب چاہتے ہیں تم سے
تمہارے ہونٹوں پر
ایک مسکراہٹ

❁❁❁

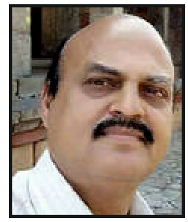

سلیم انصاری

Anand Nagar 3-HIG, Adhartal Jabalpur - 482004
(Mob. 7070135643)

مشروط واپسی

میں اب بھی
بچپنے کی سمت واپس لوٹ سکتا ہوں
مگر اک شرط ہے
یہ سرحدِ امکان تک پھیلا سمندر
وقت کے ساحل پہ بکھری سیپیاں واپس کرے
مجھ کو گھنا جنگل
مرے ہاتھوں کی ساری تتلیاں واپس کرے مجھ کو
امنگوں کی پتنگیں آسماں واپس کرے مجھکو
میں اب بھی دوڑ سکتا ہوں
مخالف سمت اپنی عمر کے، لیکن
مری معصومیاں تو چھین لی ہیں
وقت کے بے رحم ہاتھوں نے
میں اب بھی
بچپنے کی سمت واپس لوٹ سکتا ہوں
مگر شاید......کہ
خالی ہاتھ واپس لوٹنا اچھا نہیں ہوتا......

* * *

میم عین لاڈلہ

6/161 M.M.Line,Hauz Street, Jagtdal 24 PGS (N)
West Bengal- 743194 (Mob. 9331457143)

سونامی

(۲۶دسمبر ۲۰۰۴ء کی سونامی سے متاثر ہوکر)

سمندر کے کنارے
نمائش ہوتی ہے جب
برہنہ جسم کی
گرم ہوتا ہے تب
عریانیت کا بازار
قدم بہک جاتے ہیں
صراطِ مستقیم سے
ہوتی ہے جب، خالق کی نافرمانی
تب وہ، راہِ راست کی خاطر
کوئی انوکھی بات اور
کوئی کرشمہ دکھاتا ہے
قہار ہے وہ، جب طیش میں آتا ہے تو
قہر بھی ڈھاتا ہے
جو کبھی آئیلا تو کبھی
سونامی کہلاتا ہے

* * *

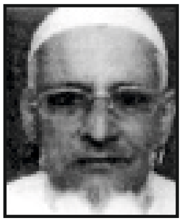

پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ

Mohalla Faizullah Khan, Darbhanga (Mob. 9431085811)

غزلیں

نمازِ شوق کا تجھ کو امام کرلیں گے
جہانِ عشق میں پیدا بھی نام کر لیں گے

بھروسہ اپنی وفاداریوں پہ ہے ایسا
کہ ایک دن اُسے ہم زیرِ دام کرلیں گے

ابھی سے راہ پہ آنکھیں بچھائیں کیوں اپنی
اگر وہ آئے تو ہم اہتمام کرلیں گے

رفو کریں گے بھی دامن کے چاک کو خود ہی
بھری بہار میں اک ایسا کام کرلیں گے

تمام عمر جئے ہم جو وضع دارانہ
ملے رقیب بھی گر تو سلام کرلیں گے

ابھی تو پیتے ہیں صہبا کسی کی آنکھوں سے
جو بند میکدہ ہوگا حرام کر لیں گے

گلہ کچھ اِس کا نہیں ہے کہ گھر نہیں اپنا
کسی کے کوچے میں جا کر قیام کرلیں گے

ہمارے سامنے صحرا ہے یا بیاباں ہے
کہیں پہ صبح ، کہیں اپنی شام کرلیں گے

ہمارے عشق کی معراج ہے یہی طرزیؔ
طوافِ کوچۂ جاناں مدام کرلیں گے

یوں محبت میں نبھانا چاہیے
ہر ستم پہ مسکرانا چاہیے

معتبر ہو گی اُسی دم بندگی
خود کو کھو کر اُن کو پانا چاہیے

روٹھنے پر ہم مناتے ہیں جنہیں
گاہے اُن سے روٹھ جانا چاہیے

رب سے ہی سر کو بلندی ہے ملی
بس وہیں جھکنا جھکانا چاہیے

چاہے جو گزرے بھی جسم و جان پہ
اپنی عزت کو بچانا چاہیے

زندگی میں جو رکاوٹ آئے بھی
راہ سے اُس کو ہٹانا چاہیے

اپنا گھر تاکہ منور کرسکیں
آسمان سے تارے لانا چاہیے

جس کو ہے اپنی وفا پہ ناز بھی
گاہے اُس کو آزمانا چاہیے

طرزیؔ ہے کوئی مصیبت میں اگر
کام بیشک اُس کے آنا چاہیے

غزلیں

منیر سیفی

Raja Bazar, Samanpura, Patna - 800014 (Mob. 9835268274)

غزل اک مصر کا بازار بھی ہے
غزل رنگینیٔ افکار بھی ہے

غزل خوابیدہ ہے ، بیدار بھی ہے
غزل اک نرگس بیمار بھی ہے

غزل پھولوں بھری ہے راہ داری
غزل میدانِ کارِ زار بھی ہے

غزل ہے وادیِ خار مغیلاں
غزل اک گلشن بے خار بھی ہے

غزل آئینہ کر دیتی ہے سب کچھ
غزل وہ آئینہ بازار بھی ہے

غزل سے کانپتا ہے قصر شاہی
غزل وہ شعلۂ اظہار بھی ہے

غزل دیوارِ گریہ بھی ہے ، لیکن
غزل پازیب کی جھنکار بھی ہے

غزل کہہ لیتے ہیں سب اہلے گہلے
غزل جینا بہت دشوار بھی ہے

غزل بادِ سمومِ غم ہے سیفیؔ
غزل اک شجر سایہ دار بھی ہے

❁❁❁

نفیسؔ انصاری خیرآبادی

Ganga Ram Colony, Bakery Wali Gali,
Kachcha , Phatak, Panipat - 132103
(Mob.8397831185)

کوئی رہنے لگا مرے اندر
اب نہیں ہے خلا مرے اندر

روشنی بانٹ دوں اندھیروں کو
جل رہا ہے دیا مرے اندر

میں برا ہوں ، بہت برا تو نہیں
کچھ نہ کچھ ہے بھلا مرے اندر

کھیلتے کھیلتے حوادث سے
آگیا حوصلہ مرے اندر

آرزوئیں سلگ سلگ کے تمام
ہوگئیں کوئلہ مرے اندر

ڈھونڈتا ہوں میں پیاس کا صحرا
موجزن ہے وفا مرے اندر

خانۂ دل میں کون آیا نفیسؔ
اب ہے عالم نیا مرے اندر

❁❁❁

مناظر حسن شاہین
H.No.60 "Millat Colony" Gaya - 823001 (MOb 9661214111)

غزلیں

وہ ظلمتوں کے گھنیرے کہرے نوائے دل سے پگھل رہے ہیں
لہو سے اپنے جنہیں جلایا ، چراغ آندھی میں جل رہے ہیں

جفائیں رقصاں ہیں بال کھولے ، قدم قدم تشنگی بچھی ہے
کبھی مری زندگی میں آؤ وفا کے چشمے اُبل رہے ہیں

چلی بہت تجربوں کی آندھی نہ ڈگمگائے قدم ہمارے
کوئی شعورِ جنوں سے پوچھے کہ ہم فدائے غزل رہے ہیں

اگر ہے تاریکیوں کی یورش تو روشنی کی بھی کیا کمی ہے
تم ایک سورج کو رو رہے ہو ، ہزار سورج نکل رہے ہیں

ستم گروں سے کوئی یہ کہہ دے ، کہیں یہ پانسہ پلٹ نہ جائے
ستم زدوں کے دماغ و دل میں غضب کے طوفان پل رہے ہیں

ہوا کا رُخ موڑتے ہیں وہ تو حقیقتوں سے نظر ملا کر
کمالِ حیرت ہے ہم ابھی تک کہانیوں سے بہل رہے ہیں

ابھی اگر ہے گھنا اندھیرا ، محبتوں کی سحر بھی ہوگی
شدید نفرت کی آندھیوں میں دئے امیدوں کے جل رہے ہیں

❀❀❀

سفر کی داستاں گم ہوگئی ہے
متاعِ کارواں گم ہوگئی ہے

تذبذب میں ہیں اب شاخوں کے سجدے
پرندے کی اذاں گم ہوگئی ہے

ہمیں دولت کا کوئی غم نہیں تھا
محبت بھی میاں گم ہوگئی ہے

جہانِ شور جس سے کانپتا تھا
وہ خاموشی کہاں گم ہوگئی ہے

سلگتی دھوپ کا شکوہ ہے لیکن
تلاشِ سائباں گم ہوگئی ہے

جو کل تک میرے خوابوں کا جہاں تھی
وہ بستی ناگہاں گم ہوگئی ہے

بجھے سے ہیں تری یادوں کے جگنو
ادائے کہکشاں گم ہوگئی ہے

کسے آواز دوں ، کس کو پکاروں؟
صدائے دوستاں گم ہوگئی ہے

❀❀❀

نذرؔ فاطمی

Flat No. 201, Alnoor Mention, Haron Nagar, Patna - 801505 (Mob. 9771222617)

غزلیں

یہیں کی خاک میں یارب ملے یہ تن میرا
بہت عزیز رہا ہے مجھے وطن میرا

ہوائے بغض و عداوت کی تیز رفتاری
اُڑا کے لے گئی عجلت میں بانکپن میرا

کہاں پتا تھا کہ بس ایک اُن کے جانے سے
بجھا بجھا سا لگے گا مجھے چمن میرا

نئے لباس ہیں بچوں کے، یہ خوشی کم ہے؟
پھٹا پرانا بلا سے ہے پیرہن میرا

مقلدین کا کچھ کچھ بھرم تو ٹوٹا ہے
مگر وہیں کا وہیں ہے ابھی ''مدن'' میرا

وہ من کی بات میں کرتا ہے صرف اپنی بات
اسے میں اپنی کہوں چاہتا ہے من میرا

مجھے بھی ساتھ ترے بھیگنا ہے بارش میں
خمارِ عشق میں ہے نذرؔ تن بدن میرا

❁❁❁

ہستی کسی کی کیسے مری جان ہوگئی
دنیا یہ دیکھ دیکھ کے حیران ہوگئی

اچھا ہوا جو ساتھ مرے کچھ برا ہوا
اچھے برے کی مجھ کو بھی پہچان ہوگئی

حاصل ہوئیں سہولتیں جب خاص و عام کو
کیا اس کے بعد زندگی آسان ہوگئی

سودا ضمیر کا نہ کیا میں نے عمر بھر
میری بلا سے چاہ جو قربان ہوگئی

پرکھوں کی وہ حویلی جو میں چھوڑ، آ گیا
وہ پورے گاؤں کے لئے دالان ہوگئی

خواہش کو پر لگے تو نتیجہ یہی ہوا
ہستی مری فضاؤں میں طوفان ہوگئی

ناکامیوں کا جب نہ ہوا عزم پر اثر
تقدیر تیری نذرؔ پشیمان ہوگئی

❁❁❁

انیس نظمؔی

Makhsuspur, Champa Nagar, Bhagalpur - 812004 (Mob. 8757461273)

غزلیں

دو دلوں کے وصل کا جو سلسلہ ہے ، کم نہ ہو
روشنی جو ہے چراغِ عشق کی ، مدھم نہ ہو
کوئی صدمہ ہو نہ جس کا ، چشم جس پہ نم نہ ہو
موت بھی وہ موت کیا ہے ، جس کا رنج وغم نہ ہو
زندگی سے لاکھ برہم ہو زمانہ ، غم نہیں
زندگی سے زندگی بھر زندگی برہم نہ ہو
جینے مرنے کے لئے ویسے تو آئے ہیں سبھی
زندگی کیا اس کی ، جس کی موت پہ ماتم نہ ہو
اے دلِ بیتاب چل ایسی جگہ رہنے کو اب
ہو جہاں کوئی شریک غم کوئی ہمدم نہ ہو
یا الٰہی بزم باطل میں مری رہ جائے قدر
بات جو نکلے زباں سے میری وہ بے دم نہ ہو
اے خدا یہ پھول سا بچہ ہے نظمؔی کا چراغ
اس کے ہاتھوں میں کبھی ظلم وستم کا بم نہ ہو

❀❀❀

کاش کہ ہم بھی کہکشاں ہوتے
چاند تاروں کے درمیاں ہوتے
ہم محبت میں کامراں ہوتے
آپ ہم پہ جو مہرباں ہوتے
غنچہ و گل نہ رائیگاں ہوتے
بے وفا گر نہ باغباں ہوتے
اہل شر کی نہ سازشیں ہوتیں
نذرِ آتش نہ آشیاں ہوتے
اہل محفل نہ آج ہوتے اُداس
وہ جو ہم سب کے درمیاں ہوتے
مل گیا حسن ، عشق کو ورنہ
یہ کہاں اور وہ کہاں ہوتے
روگ ہوتا نہ عاشقی کا انہیں
آج نظمؔی بھی شادماں ہوتے

❀❀❀

اشعارِ
اصغؔر گونڈوی

نظر اُس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی جو پھول بن جائے ، کبھی رخسار بن جائے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی ، دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

یہ جلوے کی فراوانی ، یہ ارزانی ، یہ عریانی
پھر اس شدت سے تابانی کہ ہم پردہ سمجھتے ہیں

غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغؔر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شوکت صباؔ کیفی

"Saba House" Daccan Mohalla Piro, Bhojpur - 802207 (Mob. 9431848095)

غزلیں

کبھی مٹی کی طرح ہے کبھی سونے جیسا
اپنا رشتہ بھی ہے رشتوں کے کھلونے جیسا

اشک پی کر بھی سجاتا ہوں ہنسی ہونٹوں پر
میرا چہرہ نہیں لگتا کبھی رونے جیسا

یوں تو ہر روز نیا حادثہ ہوتا ہے یہاں
پھر بھی لگتا ہے سماں کچھ بھی نہ ہونے جیسا

اپنے جینے کا یہ انداز ہے سبحان اللہ
ایک اک زخم کو آنکھوں میں پرونے جیسا

دن کی مانند مری رات گزر جاتی ہے
جاگتی آنکھوں میں نشہ نہیں سونے جیسا

اپنے چہرے پہ کئی چہرے لگاتے رہیو
کبھی ہنسنے کی طرح اور کبھی رونے جیسا

تیری قربت کی تمنا ہے شب و روز مجھے
تجھ سے ملنا بھی ہے گویا تجھے کھونے جیسا

کامرانی بھی ہے ناکامیٔ حسرت میری
جا کے ساحل پہ سفینے کو ڈبونے جیسا

بے مثال آپ کا انداز تخیل ہے صباؔ
ایک کوزے میں سمندر کو سمونے جیسا

❁❁❁

دن بہت ، رات بہت ، صبح بہت ، شام بہت
آئے ہر وقت مرے حصے میں الزام بہت

اپنے کردار سے مایوس نہیں ہوتا میں
کام آ جاتا ہوں رہتے ہوئے ناکام بہت

زہر رسوائی کبھی ہے تو کبھی دار و صلیب
ملے عشاق کو سچ کہنے کے انعام بہت

اس لئے ہوگیا مشہور زمانے بھر میں
میرے رشتوں نے مجھے کر دیا بد نام بہت

جس کو دیکھو وہی مصروف نظر آتا ہے
آج کے دور میں ہر شخص کو ہے کام بہت

ظلمت غم ہی مرے گھر کا مقدر ٹھہری
زخم کی شمع سے روشن ہیں دَر و بام بہت

کہیں محرومی و نفرت ہے ، کہیں وہم و فریب
میرے زخموں نے مجھے بخشے ہیں آرام بہت

تیری شہرت یہ صباؔ کیسی زمانے بھر میں
اپنے ہی شہر میں رہتے ہوئے گمنام بہت

❁❁❁

نام کتاب	:	صحرے کی پیاس
مصنف	:	ڈاکٹر شمیم صادقہ
ترتیب نگار	:	اسلم جاوداں
ناشر	:	اردو کونسل ہند، پٹنہ
اشاعت	:	۲۰۲۳ء صفحات : ۱۶۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر آصف سلیم

واقعہ یہ ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد ڈاکٹر شمیم صادقہ کا افسانوی مجموعہ ''صحرے کی پیاس'' ۲۰۲۳ء میں جب منظر عام پر آیا تو تقریباً معدوم ہوگئی ان کی ادبی حیثیت وشخصیت کی تازہ کاری کا سامان ہوگیا۔ اس سمت میں ڈاکٹر اسلم جاوداں لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے تیس برس قبل کی اردو جہانِ افسانہ کی مشہور افسانہ نگار شمیم صادقہ کو عہد حاضر کے قارئین سے وابستہ کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے اور بحیثیت ترتیب نگار ان کے فن وشخصیت کے واسطے سے ایک مختصر، مگر جامع تعارف نامہ بعنوان ''شمیم صادقہ: ایک بازیافت'' تحریر کیا ہے جس کے مطالعہ کی بنیاد پر بہ آسانی متعلقہ قصہ فہم میں آجاتا ہے۔ اطلاع کے مطابق شمیم صادقہ کے ماقبل میں تین افسانوی مجموعے بنام ''کرچیاں'' (۱۹۷۹ء) ''ادھورے چہرے'' (۱۹۸۰ء) اور ''طرحِ دیگر'' (۱۹۸۴ء) منظر عام پر آچکے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ ''صحرے کی پیاس'' عرصۂ مدید کے بعد اشاعت پذیر ہوا ہے جس میں کل ۳۸ افسانوں کی شمولیت ہے۔ ''دو باتیں'' کے تحت ایک صفحہ مختص کیا گیا ہے جس میں اپنے خاندانی پس منظر کی بابت مختصراً چند باتیں مصنفہ نے عرض کی ہیں، مگر اپنے افسانوں کی کیفیات کے تعلق سے انہوں نے کسی قسم کی خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔

ہاں شمیم صادقہ کی ادبی حیثیت کے سلسلے میں ڈاکٹر اسلم جاوداں کا فرمودہ نہایت واضح اور بہت مناسب ہے کہ:

''شمیم صادقہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ فکر ونظر کی حامل نسوانی عظمت کی علمبردار افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں ذات کی شناخت کا معاملہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔''

بہرحال مصنفہ کے افسانوں کی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے کے عمل میں میرے ذاتی تاثرات یہ ہیں کہ ان کے افسانے اپنے سماج سے ان کی گہری وابستگی کے راست مظہر ہیں، جن میں ایک مخصوص سمت میں بطور خاص توجہ مبذول کی گئی ہے جہاں خواتین سے متعلق مختلف انداز و اطوار کے قصے ہی قصے ہیں، مثلاً رشتوں کے انتظار میں لڑکی کی بڑھتی ہوئی عمر، لڑکیوں پر ڈھائے جانے والے ستم، گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیوں کے احوال، گھر کے اندر پنپنے والے عشق کے مضر اثرات، حالات کے پیش نظر عورتوں کے ڈگر بدل دینے کے اقدام، لڑکیوں کی شادی کے بازار میں روپیوں کی تجارت، انسانی دردمندی کے عمل میں لڑکی کا مثبت کردار وغیرہ۔

اس کے علاوہ خواتین کے حوالے سے مردانہ شمولیت کے ہمراہ بھی کئی معاملات سے وابستگی کی سعی کی گئی ہے، مثلاً ''صحرے کی پیاس'' افسانہ میں عشق کے بڑے اعلیٰ تصورات ہیں کہ عورت تو دوسرے مرد کے ساتھ گھر بسانے کے بعد بھی عاشق کے تصور کو بلند مقام عطا کرتی ہے، مگر اس کا عشق اس کے تصور کو یوں زمین بوس کر دیتا ہے کہ اپنے ماقبل کے عاشق کے رشتے کے اعتبار سے اسے پانا چاہتا ہے۔

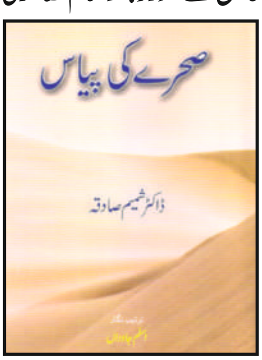

افسانہ ''آہ کو چاہئے'' میں ایک ماں بیٹے کے ساتھ رشتے کے ایک

ماموں کا کردار ہے جو بچے کے باپ کی موت کے بعد اس کی ماں کو جسم کا سودا کرنے والا بنا دیتا ہے۔ ''اُڑان'' میں عورت کی بے راہ روی کا ذکر کیا گیا ہے جس کے سبب ایک محنتی آدمی خود کو پستول سے شوٹ کر لیتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ کے افسانہ ''آج کا فردوسی'' میں ایک اعلیٰ افسر کی چاہت کا قصہ رقم ہے، جو بلا کا ایماندار ہے اور اپنی چاہت کی خاطر غلط فیصلے لینے کے سبب نوکری سے استعفیٰ دے دیتا ہے۔ عورت عورت کے مابین مثبت و منفی کردار و اطوار کو بھی اپنے ایک افسانہ ''سیاہ اور سفید'' کے توسط سے پیش کرنے کی مصنفہ نے سعی کی ہے، جہاں ایک نئی بہو اگر لاپرواہ ہے تو پرانی بہو نیک ہے، یہی نہیں سوتیلی ماں کا کردار تو لائق ستائش ہے کہ وہ محبت کی مثال ہے۔ کچھ دوسرے موضوعات کی جانب بھی انہوں نے رخ کیا ہے جس میں عورت کے واسطے سے انہوں نے کرونا بیماری کے احوال درج کئے ہیں۔

''بڑا بابو'' افسانہ میں ایک اسکول ٹیچر کی حالت خستہ کا احاطہ کیا گیا ہے جہاں اسکول ہیڈ ماسٹر اور بڑا بابو کا اس کے تئیں غیر مصنفانہ رویہ ہے تو سکریٹریٹ میں انصاف کے لئے جانے پر لوٹ کی گرم بازاری کو دکھایا گیا ہے کہ ستے داموں غریب کے زیور تک بک جاتے ہیں۔ افسانہ ''ببول کے کانٹے'' فرقہ وارانہ منافرت کے موضوع پر تحریر کیا گیا ہے۔ مزدوروں کے حوالے سے ہندوستان میں کثرت میں وحدت کے تصور کی جہاں بات کی گئی ہے، وہیں عہد حاضر کی تفریق انسانی کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ جانوروں کے تعلق کی جھلکیاں ان کے افسانہ ''تھا خواب میں'' بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو شمیم سادقہ کے یہاں موضوعات کی سطح پر خاصا تنوع ہے اپنی تحریری صلاحیت کے بوتے جنہیں وہ افسانوی پیکر عطا کر جاتی ہیں۔ مصنفہ کے افسانوں کی زبان و بیان میں بھی کسی طرح کا مصنوعی پن نہیں ہے۔ وہ سادگی اور سہیل بیانی کے ساتھ ترسیل کی الجھنوں سے مطالعہ گروں کو آزاد رکھ کر شوقِ مطالعہ کی راہیں ہموار کرنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔

امید قوی ہے کہ ''صحرے کی پیاس'' کے افسانے قارئین کے مابین مسرت کا سامان کریں گے۔

نام کتاب	:	امتیاز غدر: شخصیت اور فن		
مرتب	:	محمد انور		
ناشر	:	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی		
اشاعت	:	۲۰۲۳ء		
صفحات	:	۲۰۰	قیمت :	۳۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر نظر امام		

اس وقت ایک خوبصورت کتاب ''امتیاز غدر: شخصیت اور فن'' بغرض تبصرہ پیش نظر ہے جس کے مرتب محمد انور ہیں، انہوں نے فنی سطح پر اس کتاب میں نئے تجربے کے ساتھ امتیاز غدر کی شخصیت اور ان کے فن پر ملک بھر سے لکھے گئے مضامین کا بہترین طریقے سے تجزیہ کیا ہے۔ اچھے انسان میں ہی ایک اچھا تخلیق کار چھپا ہوتا ہے، اپنے ناول ''علی پور بستی'' افسانوں کا مجموعہ ''پلازمہ'' اور افسانچوں کا مجموعہ ''پیچھے چھوٹتے لوگ'' اردو ادب کو دے کر امتیاز غدر نے بہرحال اپنی بہترین صلاحیتیں سامنے لائی ہیں۔ اپنے جامع اور مدلل مقدمہ میں محمد انور لکھتے ہیں:

> ''ہر فنکار اپنے تخلیقی جہان میں ایک معنویت کا جہان سموتا ہے۔ وہ خواہ کسی بھی صنف پر قلم اٹھائے اس کے موضوع کی تفہیم میں کسی قسم کا انتشار نہیں ہوتا، اظہار کے لئے ایک محور ضروری ہوتا ہے اور یہ کام امتیاز غدر کے یہاں کئی اصناف کے لکھاری ہونے کے باوجود واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔''

امتیاز غدر کی نثر لہجے کی مماثلت سے پرے ہے، اسی لئے ان کے قلم سے لکھی گئی نثر انتہائی دل نشیں اور شگفتہ ہے، آپ واقعی ایک ایسی نثر کے لکھاری ہیں جس کے مطالعے سے مزید مطالعے کی پیاس جاگ اُٹھتی ہے، مطالعہ کے سفر میں کہیں بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ناول کے ساتھ ساتھ افسانوں میں وقوع پذیر سارے واقعات بھی اپنے سچے اور کھرے پن کا واضح احساس دلاتے ہیں۔

امتیاز غدر کی شخصیت اور فن پر لکھنے والے مشاہیر ادب میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر محمد نوشاد عالم، عمران عظیم، محمد سعید احمد،

انصاری اطہر حسین ساحر داؤدنگری، صبیحہ اطہر، سائرہ عظیم، پروفیسر عرفان آصف، مشرف عالم ذوقی، سلیم انصاری، ڈاکٹر حبیب سیفی، ڈاکٹر شکیلہ کے۔ پی، محمد سمیع الدین خلیق، محمد علی آزاد انصاری، ڈاکٹر واثق الخیر، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر کے۔ پی۔ شمس الدین اور آصفہ جوہی شامل ہیں۔

اپنے عہد کو جینے والے وقت وحالات کا سامنا کرنے والے امتیاز غدر نے اپنی نثر رنگین ودلکش بنانے کی خاطر وصال، ہجر، حسرت و یاس، رقابت، فرقت، شکایات، امید، وارفتگی، شیفتگی، سنجیدگی، حیات و ذات اور کائنات کے ہرایک موضوع کو گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی حسن بیان کی وہ خوبیاں بھی برتی ہیں جو عموماً اردو زبان کی تحریروں میں کم دیکھی جاتی ہیں۔ امتیاز غدر اچھی طرح واقف ہیں کہ حسن بیان کا استعمال ہندی زبان کی لفظیات کی مدد سے یا آسان ہندوی زبان کے استعمال ہی سے ممکن ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی نثر نگار آج کے زمانے میں کامیاب مشکل سے ہوگا، اسی لئے ان کے یہاں یہ خوبی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی زبانی:

''میں نے امتیاز غدر کے تقریباً ایک درجن افسانچے ایک ہی نشست میں پڑھے ہیں۔ 'یقین کے پردے میں گناہ'، 'خواہش'، 'ریڈلائٹ ایریا'، 'شک'، 'ساتھ رہنے کی سزا'، 'سرچڑھے ایماندار'، 'چوڑی والی'، 'یہ کیسی رحم دلی'، 'مولوی پنڈت'، 'شہید امر رہے'، 'فکر اور میس کال' جیسے افسانچے پڑھ کر ایک مجموعی تاثر ابھرتا ہے کہ ان افسانچوں میں خام مواد موجود ہے۔ یعنی امتیاز غدر کے اندر ایک حساس اور مضطرب فنکار موجود ہے، جس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ امتیاز غدر کے افسانچے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان میں سماج کے ناسور، برائیاں اور انسانی ذہن کی خباثتیں موجود ہیں۔ سبق آموز واقعات ہیں تو گہرے طنز بھی ہیں۔''

میرا خیال ہے پروفیسر محمد مسلم سے لے کر امتیاز غدر تک تقریباً بہ اعتبار تعداد سو سے زیادہ افسانہ نگار جھارکھنڈ میں ایسے ہوئے ہیں جن کے افسانے اردو زبان کے معیاری رسائل وجرائد میں تسلسل سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ امتیاز غدر چونکہ اپنے تخلیقی ادب سے معاشرہ کی برائیوں کو ختم کرنے کی صدق دلی سے کوششیں کررہے ہیں، اس لئے ان کے ذریعے لکھا جانے والا ادب نیک عمل کے زمرے میں آتا ہے۔ افسانچہ، ناول، افسانہ غرض کہ کچھ بھی پڑھو ایک الگ رنگ میں ہی امتیاز غدر دیکھنے کو ملیں گے۔

ڈاکٹر حبیب سیفی نے اپنے مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ امتیاز غدر کا ناول ''علی پور بستی'' تخلیقی مقصدیت سے معمور ہے اور ''علی پور بستی'' کے اخلاقی اور سماجی نقطہ نظر کو رکھ کر بات کی گئی ہے۔ حبیب سیفی کی نظر میں عہد کے حقائق ناول میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ناول میں زندگی کے ہر تقریباً ہر پہلو کو فن کارانہ انداز میں لائق توجہ

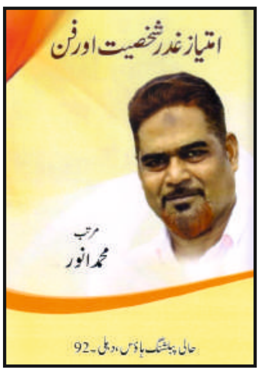

بنایا گیا ہے۔ امتیاز غدر کے ناول میں مقصدیت حاوی ہے۔ میرے نزدیک آج کے ہندوستان اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی تصویر نئے موضوعات کے علاوہ الیکشن میں ووٹنگ کرنے کی اہمیت ووقعت کے نام پر امتیاز غدر نے جس محنت سے بنائی ہے اور اس میں تلخ زندگی کی حقیقتوں کے رنگ بھرے ہیں اس کے لئے امتیاز غدر تا دیر یاد رکھے جائیں گے۔

مانا کہ ناول میں پلاٹ اور بعض اوقات کردار تک فرضی ہوتے ہیں، لیکن ان کرداروں میں امتیاز غدر نے حرارت پیدا کی ہے، یہ ان کے فن کی خوبی ہے۔ وہ افسانوں کی بنیاد حیرت انگیز مظاہرات پر نہیں رکھتے بلکہ انہوں نے حادثات، واقعات، مہلک امراض، سوکھا اور سونامی، غریبی ظلم وزیادتی، ناانصافی وحق تلفی جیسے موضوعات پر اس کی بنیاد رکھی ہے اور پھر افسانچوں میں عشق ومحبت کے اہم عنصر، تہذیبوں کے تصادم، بدلتی قدروں کا نوحہ، عام انسانی زندگی کی دلچسپی کا باعث بننے والے رسم ورواج اور ان کے خلافِ توقع نتائج سے پیدا ہونے والی خرابیوں پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں۔

محمد سمیع الدین خلیق نے اپنے مضمون ''امتیاز غدر کا ناول:

علی پوربستی'' میں مسلم سماج کے مسائل کی پیش کش میں ناول نگاری کے فن پر امتیاز غدر کی کڑی محنت کے تعلق سے درست لکھا ہے کہ انہوں نے اس ناول کے ذریعہ ہندوستان کی پسماندہ قوموں اور پست ترین بستیوں کا نظارہ دکھایا ہے اور انتھک محنت و جفاکشی کے ساتھ علم و دانش راہوں کو پامال ہونے سے بچایا ہے۔ ہندوستان میں مسلم طبقہ سماج کا وہ طبقہ ہے جو آج دلتوں سے بھی زیادہ بدتر زندگی گزار رہا ہے۔

امتیاز غدر کے افسانے بھی عصری موضوعات پر مبنی ہیں اور افسانچے بھی۔ ایسا میں اس لئے بھی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے افسانوں کے ذریعہ بھی غربت زدہ گھروں اور جدوجہد کرتے ہوئے لوگوں سے قارئین کا تعارف کرایا ہے اور موجودہ حالات پر لکھی گئی کہانیوں میں انتہائی دردمندی سے لبریز واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی نویس نے ان میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان کے افسانچوں کا پیرایۂ بیان اتنا دلکش ہے کہ قاری خود اس درد و کرب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ کتاب میں کچھ تبصرے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ امتیاز غدر کی کتب پر تبصرہ کرنے والوں میں ڈاکٹر حبیب سیفی، شگفتہ پروین، ام ماریہ حق، ڈاکٹر داؤد احمد، ساحر داؤد نگری، ایس ٹی رضا، مبشر عالم، ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری، نصیر افسر، صبیحہ اطہر، عمران عظیم و سائرہ عظیم شامل ہیں۔ امید قوی ہے کہ جناب محمد انور کی یہ مرتبہ کتاب باذوق حلقوں میں خاص طور سے پسند کی جائے گی۔

نام کتاب	:	تذکرۂ جمیل	
مصنف	:	عطا اللہ پالوی	
ناشر	:	ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ	
اشاعت	:	۲۰۲۴ء	صفحات: ۸۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے	
مبصر	:	کاظم رضا	

زیر نظر کتاب ''تذکرۂ جمیل''، ضلع چھپرہ بہار کی مقبول و ہردلعزیز شخصیت اور عظیم سماجی خدمتگار جناب وجاہت حسین کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے۔ تذکرہ نگار کا فریضہ عطا اللہ پالوی نے انجام دیا ہے، جن کا شمار بہترین اور معروف مصنّفین میں ہوتا ہے۔ پالوی صاحب کی یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد پہلی بار منظر عام پر آئی ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ علم وادب کے مختلف شعبوں کے ساتھ تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ ان کی تحریریں صاحب سوانح کے اخلاق و سیرت، کردار و عمل، فکر و شعور، عزم و استقامت، گنگا جمنی تہذیب و رحم دلی، مساوات و برابری، قومی و ملی خدمتوں اور انتظامی صلاحیتوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اسلوب بیان بالکل سادہ ہے۔ زبان بھی رواں ہے اور سطر سطر سے اخلاص و محبت کے جذبے پھوٹ رہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ممدوح کی اعلیٰ شخصیت سے وہ نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان سے گہرے مراسم و دوستانہ تعلقات بھی تھے۔

نفسیاتی طور پر جب کسی مبصر کے پاس کوئی کتاب تبصرے کے لئے آتی ہے تو سب سے پہلے مبصر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ سرورق، پشت کے فوٹوگرافس، اندرونی فلیپ پر نظر ڈالتا ہے اور پھر آخر میں بوقت فرصت، نگارشات کو زیب نگاہ بناتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرورق پر وجاہت حسین اور پشت پر عطا اللہ پالوی کی تصاویر کا انتخاب بے حد سوجھ بوجھ اور نفاست و ذہانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تحریروں پر نظر ڈالنے سے بھی نہ صرف وجاہت حسین کی پروقار و مہذب شخصیت کا خوبصورت ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، بلکہ ان کی خاندانی عظمت و شرافت نفسی کے تعلق سے وسیع تر معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں بہت سارے لوگ موصوف کو دور ہی سے جانتے پہچانتے ہوں گے۔ میں خود بھی انہیں لوگوں میں شامل ہوں، لیکن کتاب کے مطالعہ سے صاحب سوانح کی مثالی شخصیت کے بے شمار ایسے پہلوؤں سے واقفیت ملتی ہے جو عہد حاضر میں ہر خاص و عام کے لئے قابل رشک ہی نہیں، قابل تقلید بھی ہے۔

جناب وجاہت حسین شہر چھپرہ کے ایک ممتاز فرد، کامیاب تاجر اور ہندو مسلم اتحاد کی روشن علامت تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے اعلیٰ خاندان سے تھا جہاں برسوں سے علم و انصاف کی حکمرانی قائم تھی۔ ان کے جد امجد شفقت حسین سلطنت مغلیہ کے دور حکومت میں قاضی کے بلند عہدے پر فائز تھے۔ ان کے والد گرامی راحت حسین مرحوم نے چھپرہ

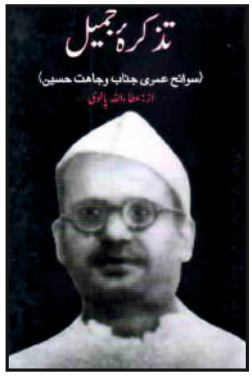

ہی میں ''راحت اینڈ کمپنی'' کے نام سے ایک فرم قائم کر رکھا تھا جس کو تجارت کے میدان میں ہمہ جہت شہرت حاصل ہوئی۔ چھپرہ میں راحت روڈ انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ وجاہت حسین نے بھی میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تجارتی پیشہ اختیار کیا اور اپنی ایمانداری، خوش اخلاقی اور انتھک جدوجہد سے کمپنی کی عزت وشہرت میں چار چاند لگایا۔ وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۱ء تک مرچنٹس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک وارڈ نمبر ۷ میں میونسپل کمشنر کے عہدے کو اعزاز بخشی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۷ء تک ''انجمن خدمت سخن'' اور ''ساہتیہ بھون'' کے ممبر رہنے کے ساتھ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک چھپرہ سنٹرل کنزیومرس آپریٹو لمیٹڈ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ اس طرح انہوں نے نوع بنوع قومی، علمی، سماجی، ملکی اور سیاسی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہیں خدمات عالیہ کے پیش نظر انگریزی حکومت نے ان کو ''خان صاحب'' کے خطاب سے نوازا۔ ان کے رفقا اور قدردانوں کی فہرست بہت لمبی ہے، جس میں مولانا مظہر الحق، بابو رام چندر پرساد (صدر جمہوریہ) ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سری کرشن سنہا، سر سلطان احمد بار ایٹ لا، سید محمود مہدی علی سکریٹری جدہ سفارت خانہ، بی کے دتا آئی اے ایس، جسٹس نقی احمد، ڈاکٹر کے پی مشرا، سید محمد فضل آئی پی ایس، سید افضل اے ڈی ایم محمد یونس، سابق چیف منسٹر عبدالغفور وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کی عزت ومقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کا یکم فروری ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا تو شہر کی ساری دکانیں بند ہوگئیں، تمام تعلیمی اداروں میں چھٹی دے دی گئی، میونسپل بورڈ نے اپنے کاروبار بند کردیا اور مختلف تنظیموں نے تعزیتی اجلاس منعقد کر کے خراج عقیدت پیش کیا۔

''تذکرۂ جمیل'' ایک بیحد مختصر تذکرہ ہے، لیکن دلچسپیوں کا حامل ہے، اس کے مصنف عطاء اللہ پالوی کے نزدیک کسی مثالی شخصیت کے اعزاز میں مجسمہ نصب کرنا یا اس کے نام سے کسی سڑک یا لین کو منسوب کرنا کوئی مستقل اعزاز نہیں ہے کیوں کہ مرور زمانہ کے ساتھ وہ شخصیت قصہ پارینہ بن جاتی ہے، البتہ اس کی زندگی کے گوناگوں محاسن و مکارم اور نوع بہ نوع رجحانات و کیفیات کو کتابی شکل دے دی جائے تو وہ شخصیت زندہ جاوید ہوجاتی ہے۔ تذکرہ نگار نے اپنے اس خیال کو درست قرار دیتے ہوئے مختلف مغربی ومشرقی دانشوروں کے خیالات سے استفادہ کیا ہے اور ان کے حوالوں کے ساتھ قرآنی مضمرات بھی درج کئے ہیں، جو ان کے ہمہ گیر ہمہ جہت مطالعے کے مظہر ہیں۔ انہوں نے اپنی تمہید میں سوانح عمری، تذکرہ، سرگزشت، بایوگرافی، خودنوشت، آپ بیتی، سروس بک، اعمال نامہ، مصوراور مورخ جیسی اہم اصطلاحات کی تعریف وتشریح سے بھی بحث کی ہے اور ان کی خوبیوں وخامیوں کے دائروں کا تعین کیا ہے جو مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پالوی صاحب نے جناب وجاہت حسین کے تذکرے میں اپنے بعض احباب کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کی شخصی خوبیوں کو خوب سراہا ہے۔

''تذکرۂ جمیل''، محض اسّی (۸۰) صفحات پر محتوی ہے، کتاب کا انتساب جاوید حسین کے نام سے کیا گیا ہے، پھر اشاریہ کے بعد جناب جسٹس شمس الاسلام جعفری سابق جج ہائی کورٹ الہ آباد کے ''چند کلمات'' کے ساتھ جاوید حسین کا تاثراتی مضمون ''تعارف عطااللہ پالوی'' شامل ہے۔ اس کے بعد سید محمد یوسف پھلواروی نے ''تذکرۂ جمیل'' پر جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اسے شمولیت بخشی گئی ہے، پھر طارق حسین، پروفیسر محمد رضوان خاں، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کے تاثراتی افکار وخیالات ملتے ہیں جو صفحہ ۱۲ سے صفحہ ۲۵ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مصنف نے بیس صفحات پر تمہید بیان کی ہے جب کہ ۳۴ صفحات تذکرہ کے لئے مختص ہیں۔

زیر نظر کتاب جناب وجاہت حسین کی بے مثال شخصیت اور ان کے احوال وآثار پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے، جس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے مفید و کارآمد ہوگا جو شخصی خوبیوں اور انتظامی امور سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کتاب میں صرف ایک ہی بات طبیعت پر گراں گزرتی ہے اور وہ ہے اس کا نام۔ اگرچہ صاحب تذکرہ کے کردار وعمل کا جمالیاتی رنگ جو بیان نہیں آیا ہے اس اعتبار سے یہ نام نامناسب ہرگز

نہیں، تاہم اس عنوان سے غلط فہمی کا امکان بھی پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس سے صاحب سوانح کے نام و شخصیت کی وضاحت نہیں ملتی۔ بہر حال مجھے توقع ہے کہ باذوق اور ایک مخصوص حلقہ میں کتاب کی پذیرائی یقیناً ہوگی۔

نام کتاب	:	دھوپ چھاؤں کا رقص
مصنفہ	:	شبانہ عشرتؔ
ناشر	:	جی این کے پبلی کیشنز، بڈگام (جموں کشمیر)
صفحات	:	۱۳۶ قیمت : ۲۵۰ روپے
مبصرہ	:	مشہودہ خاتون

دنیا کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ایک بڑی سچائی ابھر کر سامنے آئے گی جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ وہ سچائی یہ ہے کہ زمین کے ہر خطہ میں خواتین نے تہذیب و معاشرت، علم و فلسفہ، سیاست و حکومت، نقد و نظر اور شعر و ادب میں اپنی صلاحیتوں کے خوب جواہر دکھائے ہیں۔ بالخصوص ہندو پاک کے آسمان شعر و سخن پر بے شمار شاعرات ماہ و نجوم کی صورت چمک رہی ہیں، اس کا خاص سبب یہی ہے کہ عورت کے مزاج و طبیعت کو فطری طور پر شعر و شاعری جیسے فن لطیف سے خاص مناسبت ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ چمن زار سخن اس کے احساسات و خیالات کی خوشبو سے محروم رہ جائے۔

ایک زمانہ تھا کہ مخصوص حالات کے پیش نظر شعر و شاعری میں شاعرات کی حصہ داری بہت کم رہی، لیکن اب وہ زمانہ لد چکا ہے۔ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس میدان میں بھی ان کی بکثرت نمائندگی دیکھی جاسکتی ہے۔ بیسویں صدی کو اردو شاعرات کے ورود کا زرخیز عہد کہا جاسکتا ہے، جس میں ان کی قدر و منزلت بھی ہوئی اور ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف بھی ہونے لگا۔ موجودہ عہد میں اردو شاعرات کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ ان کے ذکر کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں داراب بانو وفاؔ، نور جہاں ثروتؔ، مسعودہ حیاتؔ، شاہجہاں بانو یادؔ، فہمیدہ ریاضؔ، کشور ناہیدؔ، پروینؔ شاکر اور ترنم ریاض جیسی اہم شاعرات شامل ہیں، جن کا اپنا ایک منفرد انداز و آہنگ، لب و لہجہ اور اسلوب ہے اور شعر و ادب میں ان کی اپنی مستقل شناخت بھی ہے۔

ریاست بہار بالخصوص شہر عظیم آباد کی سرزمین نے بھی گزشتہ دہائیوں کے دوران بڑی تعداد میں اردو شاعرات کو پیدا کیا۔ ان میں ایک بڑا پروقار نام شبانہ عشرتؔ کا ہے، جن کا دوسرا شعری مجموعہ ''دھوپ چھاؤں کا رقص'' اس وقت پیش نظر ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ ''دھند میں لپٹا چاند'' شائع ہو چکا ہے، جس کی شعری حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور بہت سے دانشوروں نے ستائشی کلمات کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

شاعری دراصل جذبات و احساسات کے اظہار اور تجربات و مشاہدات کی ترجمانی کا نام ہے۔ یہ دل کی آواز ہے جو دلوں پر دستک دیتی اور دلوں کو تسخیر کر لیتی ہے۔ شبانہ عشرتؔ کی شاعری بھی ان خصوصیات سے مالا مال ہے۔ وہ اپنے دل کی آوازوں پر توجہ مرکوز رکھتی ہیں اور سادگی و سلاست کے ساتھ اپنے جذبوں کا اظہار کرتی ہیں۔ انہوں نے اظہار جذبات میں انسانی فطرت کا اتباع کیا ہے کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ جذبات، فطرت کے خلاف ہوں گے تو شعروں میں اصلیت باقی نہیں رہے گی اور اس کے نتیجہ میں کلام اثر سے محروم ہو جائے گا، جب کہ شاعر کا کام ہے اصلیت میں جاذبیت پیدا کرنا۔ خیالوں کا الجھاؤ اور پیچیدگی سے مبرا ہونا سادگی ہے اور یہی سادگی دبستان عظیم آباد کی امتیازی شان ہے۔ ان کے شعروں میں مذکورہ خیالوں کا وہ عکس موجود ہے جو گہرے تجربے اور کائنات کے وسیع تر مشاہدے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

غزل کے روایتی محاسن، خلوص، والہانہ کیفیت، نغمگی، تغزل اور سلاست روی ہیں۔ عشرتؔ نے اپنے کلام میں ان خوبیوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کے ریاض، ذہنی کاوش اور سلامت طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جدید لب و لہجہ بھی پر کشش اور جالب دل ہے ۔

مرا غرور بھی تو ، میرا پاسبان بھی تھا
مری حیات بھی تو ، میرا اک جہان بھی تھا
وہ ایک شخص مگر کائنات ہو جیسے
مری زمیں ہی نہیں وہ تو آسمان بھی تھا

شاعری کے لئے دیگر خصوصیات کے علاوہ حس لطیف احساس، نازک طبعی،

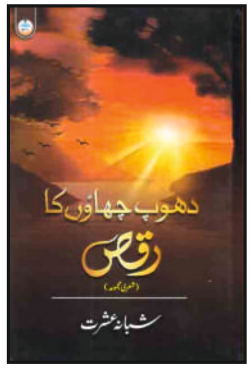

حساس دل، پر درد مزاج اور اخلاص و وفا کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب کچھ عشرتؔ کے دامن سخن میں موجود ہے۔ زبان و بیان بھی سادہ و شستہ ہے اور اظہار کا سلیقہ بھی شاعرانہ ہے اس لئے قدرتی طور پر ان کے اشعار میں تاثیر بھری ہوئی ہے اور کلام بھی پر درد ہوتا ہے۔ برسبیل تذکرہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آسیب زدہ گھر میں گزارا نہیں ہوتا
بے جان نگاہوں میں سویرا نہیں ہوتا
لازم ہے کہ بانہوں کا سہارا بھی ہو شامل
یادوں پہ سدا دل کا گزارا نہیں ہوتا
تہمت بھی گوارا کریں ، الزام اٹھائیں
اتنا بھی کوئی جان سے پیارا نہیں ہوتا

عشرتؔ کے یہاں عشقیہ مضامین، تشنگی، ناپختگی، خودسپردگی، بیزاری، تنہائی، خوداعتمادی، تنہائی، کشمکش وغیرہ کی عکاسی ملتی ہے، جو تانیثی رویے کی روشن علامات ہیں، لیکن ان میں مزاحمت و جارحیت پسندی اور تانیثی بیان کے نام پر بے حیائی اور بے سمتی نہیں ملتی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نسائی جذبات میں ایک خاص توازن، سلیقہ اور ٹھہراؤ کا رنگ موجزن ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

جب تشنگی نے ضبط مرا آزما لیا
پھر کیا تھا مرے واسطے دریا ابل پڑا
پرچھائیوں کے ساتھ نبھاتا وہ کب تلک
اچھا ہوا کہ چھوڑ کے رستے سے چل پڑا

دھوپ ہے نہ بادل ہے، چھاؤں ہے نہ آنچل
بھیگتی رہی میری یوں ہی چشم تر تنہا
آپ کو مبارک ہوں محفلیں بہاروں کی
میرا کیا اگر میری ہوگئی سحر تنہا

نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے اکثر
مری قربت سے وہ بیزار ہے کیا
مرے جذبوں کی قیمت مت لگانا
یہ میرا دل کوئی بازار ہے کیا

جیسے تاوان بھر رہی ہوں میں
کیسے گزری ہے زندگی مت پوچھ
ہے شب ہجر چاندنی کا سماں
اس پہ پائل کی راگنی مت پوچھ

زیر تبصرہ شعری مجموعہ ''دھوپ چھاؤں کا رقص'' ایک ایک حمد و نعت کے علاوہ ۳۶ غزلوں اور ۲۴ آزاد نظموں پر محتوی ہے۔ غزلوں کے برعکس نظموں میں نظام ظلم و جبر کے خلاف مزاحمتی انداز نمایاں ہے۔ زندگی کی ناامیدیوں، محرومیوں، اذیتوں اور نفرتوں کے ساتھ بعض سماجی و سیاسی مسائل پر بھی رائے کا برملا اظہار ملتا ہے۔ اس باب میں ''خدا تو کہاں ہے''، ''عید کیسی آئی''، ''میں فلسطین ہوں''، ''آگ کا انجام'' بہترین نظمیں ہیں۔ غزلوں میں بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں شعری معائب کی موجودگی سے طبیعت میں کبیدگی پیدا ہوتی ہے، ان میں کمپوزنگ کی خامیاں بھی شامل ہیں۔ یہ سب عیوب بشری کام اور کلام کے تقاضے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہی عیوب حوصلوں کو بلندی اور قدم سنبھال کر آگے بڑھانے کا شعور بخشتے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ کے آخری اوراق میں پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر محسن رضا رضوی اور محمد کلیم ضیاؔ کی تاثراتی تحریروں کو شمولیت بخشی گئی ہے، اسی کے ساتھ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین اور شکیلؔ سہسرامی کے دو عدد تبصرے بھی ملتے ہیں جو شبانہ عشرتؔ کے پہلے شعری مجموعہ ''دھند میں لپٹا چاند'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیر نظر خوبصورت کتاب کی اشاعت میں اردو ڈائریکٹوریٹ حکومت بہار کی مالی اعانت شامل ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی اور خاص و عام کی نگاہوں کی زینت بنے گی۔

☆ ’’زبان وادب‘‘ اکتوبر ۲۰۲۴ء ملا۔ اس شمارے میں سرورق سے لے کر بچوں کے حصے تک آپ نے مہینہ کی مناسبت سے جو اہتمام رکھا ہے، وہ خاص طور سے پسند آیا۔ اس طرح خوبصورتی بھی آگئی ہے، معنویت بھی اور دستاویزی کیفیت بھی اور خاموشی سے ایک نفسیاتی حوصلہ بھی ملا ہے کہ بہر حال ہمارے ملک کے یادگاری ڈاک ٹکٹ اردو تحریر سے محروم نہیں ہیں۔ اس شمارے کے پہلے اندرونی سرورق پر جنمے جے مترا ارمان کو جگہ ملی ہے۔ کم از کم مجھ جیسے قاری کے لئے تو اس ہندو بنگالی شاعر اور اردو شعرا کے تذکرہ نگار کا نام اس سے پہلے بالکل ہی انجان تھا، اسے پڑھ کر خیال آیا کہ واقعی وقت کے ساتھ ساتھ تہذیبی ترجیحات کے رُخ کس طرح بدل جاتے ہیں اور اپنی کیسی کیسی یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں اور پھر یہ بھی ہمارے محققین کا بڑا احسان ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں اور آنے والوں کے لئے محفوظ کر دیتے ہیں۔ اس شمارے کی ’’یادیں‘‘ چار شخصیتوں کا احاطہ کر رہی ہیں اور اس میں دورائے نہیں کہ اُن کے بارے میں لکھنے والوں نے محنت اور معلومات کی یکجائی کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کر دیا ہے۔ کہکشاں پروین یقیناً خاتون افسانہ نگاروں کی فہرست کا بڑا معتبر نام تھا، افسوس کہ اسی سال کے وسط میں ان کا قلم ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ ان کی یادیں تازہ کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے ان کی کہانی ’’تواپر کی عورت‘‘ کے تجزیہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ بیشک ’’عورت کو محبت نہیں، عزت چاہئے‘‘ تانیثی کرب کو سمجھنے کے لئے اس جملہ کی بے پناہ معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک اس حصہ کے دیگر مضامین کا تعلق ہے، وہ سبھی اپنے اپنے رنگ میں متوجہ کر گئے۔ ظفر اوگانوی پر لکھی گئی تحریر میں جناب نثار احمد صدیقی کا اپنا رنگ ہے تو ’’مظفر حنفی کی کہانی میری زبانی‘‘ میں انجینئر فیروز مظفر کے تفصیلی بیانات کا اپنا رنگ اور بلاشبہ یہ سبھی رنگ اپنی اپنی جگہ بہت چوکھے رنگ ہیں۔ جناب محمد جمال الدین اطہر نے پروفیسر احمد حسن دانشؔ کو ایک استاد اور سماجی خدمتگار کی حیثیت سے یاد کیا ہے تو اگرچہ اس میں ان کے یہاں عقیدت کا رنگ ملتا ہے، مگر حسن تحریر یہ ہے کہ انہوں نے اُسے خالی عقیدت کا رنگ نہیں لینے دیا ہے بلکہ تھوڑی سی تشنگی کے ساتھ ہی سہی، ان کی علمی و ادبی خدمات اور شاعرانہ رنگ و آہنگ کو بہر حال اُجاگر کر دیا ہے۔ ’’مقالات‘‘ کے حصے میں راشد انور راشد کی خاکہ نگاری پر ڈاکٹر محمد قیام نیر کی تجزیاتی نظر بھی اپنی اہمیت اور گہرائی کا احساس دلا رہی ہے، البتہ ’’ناصرؔ کاظمی کی شاعرانہ عظمت‘‘ پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر یاسمین اختر نے بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ ’’امین اعجاز کی نعتیہ شاعری‘‘ پر تنویر رضا برکاتی کا مضمون بھی لائق مطالعہ ہے۔ اس حصہ کا آخری مضمون ’’فن تاریخ گوئی کی اہمیت وافادیت‘‘ اگرچہ موضوع کے لحاظ سے بہت وقیع ہے اور اس میں سید محمد علی رضوی نے متعلقہ مواد کی شناخت کے شعور کا ثبوت بھی دیا ہے، لیکن ان کی اجمال پسندی بہر حال اس کی انتاجی کیفیت کو غیر تشفی بخش چھوڑ گئی ہے، اسے مزید توضیحات کی طرف لے جانے کی ضرورت تھی۔ ’’افسانے‘‘ کے حصہ میں سبھی کہانیاں عمدہ ہیں، خصوصاً مترجمہ کہانی ’’جینے کی راہ‘‘ بہت ہی متاثر کر گئی۔ ان کہانیوں کے بارے میں آپ نے ’’حرف آغاز‘‘ کے تحت جو تعارفی سطریں لکھی ہیں، وہ بہر حال دیانت اور توازن کا وصف رکھتی ہیں۔ ’’اللہ کی لاٹھی‘‘ (ڈاکٹر قیصر زاہدی) میں اگرچہ کہانویت کے وصف کی کمی کا احساس ہوا، لیکن پھر ایس معشوق احمد کے انشائیہ ’’کاٹ کھانا‘‘ تک پہنچتے پہنچتے یہ احساس یوں بدلا کہ انہوں نے اس میں فنی لحاظ سے کہانویت کو کفر کے درجہ میں ہی رکھا ہے اور انشائیہ کو کامیابی سے منزل تک لے گئے ہیں۔ اس شمارے کے شعری حصے بھی عموماً تشفی بخش ہیں اور تبصرے بھی متوازن۔ ’’بچوں کا زبان وادب‘‘ میں بھی ان کے مزاج اور ان کی عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے شخصیتوں پر مضامین شامل ہوئے ہیں۔

(ڈاکٹر) ضیاء الدین ضیاؔ، نالندہ

☆ ماہ اکتوبر۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' موصول ہوا۔ پہلے تو اُس خوبصورت ٹائٹل پر دیر تک نگاہ ٹکی رہی جو کئی یادگاری ڈاک ٹکٹ سے سجا سجایا ہے اور جب اندر کے رنگین ورق دیکھا تو اس پر اُن شخصیتوں کی مختصر مختصر سوانح حیات بھی پڑھنے کو ملی۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا تھوڑا تھوڑا شوق مجھے بھی ہے، اس لئے بھی اس بار کے میگزین کا کئی صفحہ میرے لئے دلچسپ بن گیا اور پھر اس کے بعد جب ''بچوں کا زبان و ادب'' والا حصہ دیکھا تو دل اور بھی خوش ہوگیا کہ اس پر بھی ڈاک ٹکٹ کی تصویریں موجود ہیں۔ ایک بات سے اور بھی خوشی ہوئی کہ مجھے پہلی مرتبہ ایسے ڈاک ٹکٹ دیکھنے کو ملے، جن پر اردو میں بھی لکھا ہوا ہے۔ اس بار کے میگزین میں اکتوبر کے مہینہ کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ نے بڑوں کے حصہ میں تو کچھ چیزیں ڈالی ہی ہیں۔ شکر یہ کہ آپ نے بچوں کے حصہ میں بھی اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ ''گاندھی جی کا بچپن'' کے عنوان سے جناب عظیم اقبال کا مضمون بہت ہی اچھا، دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس مضمون میں مجھے پہلی بار یہ پڑھنے کو ملا کہ گاندھی جی کا بچپن میں پکارنے کا گھریلو نام ''مونیا'' تھا۔ ان کا جیون گویا ''مونیا'' سے ''باپو'' بننے تک کے کامیاب سفر کا آئینہ ہے جو ان کے تئیں ہمارا احترام بڑھاتا ہے اور ان کی بچپن کی معصوم کوتاہیوں سے بھی بڑی بڑی سیکھ ملتی ہے۔ اس بار کے ''بچوں کا زبان و ادب'' کی شروعات باپو کی یادوں سے ہے تو اس کا اختتام ''لال بہادر شاستری'' کے تذکرے پر ہوا ہے۔ شاستری جی کا نعرہ ''جے جوان، جے کسان'' تو بہت مشہور ہے۔ جناب علی عامر نے اپنے اس مضمون میں شاستری جی کا جو ایک قول نقل کیا ہے کہ ''مشکل کام عبادت کے برابر ہے'' وہ بھی بہت قیمتی ہے کہ جس طرح عبادت رائیگاں نہیں جاتی اسی طرح کڑی محنت کا میٹھا پھل بھی ضرور ملتا ہے۔ اس شمارے کا شخصیت پر لکھا گیا ایک اور مضمون ''ساحرؔ کے نغموں میں بچے'' بھی پسند آیا۔ جناب شرف الہدیٰ نے دو چار ہی سہی، مگر اس فلمی شاعر کے اُن گیتوں کو بڑے اچھے انداز سے نقل کر دیا ہے جن کا موضوع ہم بچے ہیں ''بچے من کے سچے......'' حیدر امام حیدر کا مضمون ''وقت کی اہمیت'' بھی بہت اچھا لگا، اس میں اصل پیغام یہی ہے کہ ''وقت کی قدر کرو'' کہ ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں'' میرا خط لمبا ہو رہا ہے، لیکن دو چیزوں کا ذکر اور بھی ہے جسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک تو جناب انور آفاقی کی دونوں پیاری پیاری نظمیں یعنی ''چندا تارے جیسے بچے'' اور ''امی پیاری'' اور دوسری چیز وہ فیلر جس کا عنوان ہے ''تم گوروں سے یہ کاگا بھلا'' اس فیلر میں پنڈت جی، بگلے اور کوے کی کہانی، یہی بتا رہی ہے کہ ان لوگوں سے خاص طور سے دور بھاگنا اور ہوشیار رہنا چاہئے جو تن کے اُجلے اور من کے کالے ہوتے ہیں۔

عامر تنویر، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' کا شمارہ ستمبر۲۰۲۴ء بدست ہوا۔ گزشتہ دو شماروں سے سرورق کے علاوہ شمارے کے اندرونی حصے میں خطاطی کے نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند کوشش ہے، اس کا سلسلہ جاری رہے تو بہتر ہے۔ ستمبر کے شمارہ کے سرورق پر بھی نستعلیق کا ایک عمدہ نمونہ اور خط ثلث کا ایک بہترین شاہکار نظر نواز ہوا۔ پہلے اندرونی سرورق پر امدادؔ عظیم آبادی کی غزل کے پانچویں شعر کے دوسرے مصرع میں کمپوزنگ اور پھر پروف ریڈنگ کے سہو سے ''معلوم ہوتا ہے'' کی تکرار راہ پا گئی ہے، بہرکیف اس شمارے کے مشمولات میں اہم اور معلوماتی مضامین دیکھ کر خوشی ہوئی اور ترتیب مضامین بھی مسرت افزا ہے۔ ''ذکر رسول اور قدیم دکنی شاعری'' کے عنوان پر محمد شوکت جمال نے ایک نسبتاً کم لکھے گئے موضوع کو لیا ہے۔ کاش وہ تھوڑی اور محنت کا مظاہرہ کرتے تو تشنگی باقی نہ رہتی۔ ''شعرائے بہار کی رباعیوں میں ذکر رسالہ مآب'' مختصر مگر جامع ہے۔ مضمون نگار محمد پرویز اختر نے اس مضمون کو صرف بارہ رباعیوں پر سمیٹ دیا ہے حالانکہ اور بھی اہم ترین رباعی گو حضرات بہار میں گزرے ہیں، ان پر تبصراتی طور پر ہی سہی گفتگو ہو سکتی تھی۔ قمر نقوی نقشبندی پر سیر حاصل مضمون شائع ہوا ہے، جو ان کی ناول نگاری کے حوالے سے ہے۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے ''صحیح اردو کیسے بولیں؟'' پر صرف ڈیڑھ صفحے کا مضمون قلم بند کیا ہے، جو عام طور پر مروجہ بول چال کی زبان اور تحریری روش کو سیدھا راستہ بتانے کی کوشش کا اہم حصہ ہے۔ اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ احسان سیوانی کی یاد میں ڈاکٹر ارشاد احمد نے

سیوان کے ایک ایسے شاعر کا ذکر کیا ہے، جو بمبئی کی سرزمین سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ مضمون تاثراتی ضرور ہے، لیکن احسان شناسی پر ایک بنیادی مضمون قرار دیا جا سکتا ہے۔ نسیمؔ ھلسوی، جو جانشین داغؔ دہلوی تھے، ان پر سلطان آزاد نے کھل کر بحث کی ہے اور ایک کم معروف شاعر کو اردو دنیا سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑی محنت سے لکھا گیا مضمون ہے۔ سوداؔ اور ان کا فارسی کلام میں سودا کی زندگی کے حالات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، جب کہ ان کی فارسی شاعری پر صرف ایک صفحہ کا مواد ہی پڑھنے کو ملا، حالاں کہ سوداؔ کی دیگر خدمات سے صرفِ نظر مضمون نگار کو سوداؔ کی فارسی شاعری کو زیادہ ابھارنا چاہئے تھا، مگر یہاں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ فراغؔ روہوی کی غزلیں برسوں سے رسائل میں پڑھتے آئے ہیں۔ یہاں ان کی غزل گوئی پر عظیم انصاری نے اچھا مضمون لکھا ہے، جس سے ان کی غزل گوئی کے اوصاف قاری کے سامنے آئے ہیں۔ ان کا ایک شعر بہت پسند آیا جو اس طرح ہے ؎

ہم سے تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا جاتا
دشت وحشت میں بھی آداب لئے پھرتے ہیں

طلحہ نعمت ندوی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی کی انشاپردازی کے عنوان سے بہار شریف کی اس عظیم شخصیت کے فن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی شخصیت سے لوگ واقف ضرور ہیں، لیکن ان کی کمال کی انشاپردازی سے ہم جیسے کم علم واقف نہیں تھے۔ یہ مضمون مولانا مسعود عالم ندوی کی تحریری خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ بات بالکل حقیقت ہے کہ ان کی تحریروں پر مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اخترؔ شیرانی کی شاعری پر زیبا راشد کا مضمون اپنے عنوان سے کچھ زیادہ لگا کھاتا نہیں دکھائی دیتا۔ بات ان کی شاعری پر ہونی چاہئے تھی، نہ کہ ان کی شخصیت پر۔ الیاس احمد گدی کے ضخیم ناول ''فائر ایریا'' پر صرف دو صفحات پر مشتمل مضمون میں اس ناول پر ارشد احمد اور سلام بن رزاق کی رائے کو پیش کیا گیا ہے اور اس ناول سے صرف دو اقتباس نقل کئے گئے ہیں۔ یہ مضمون تفصیل کا متقاضی ہے، مگر یہاں اختصار نے راہ پائی ہے، جو مضمون کا متقاضی نہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں ایک مشہور فارسی رُمان نویس، ناول نگار صادق چوبک کے افسانہ ''عدل'' کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے، مگر یہ بالکل لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے، اس میں تراکیب اور کچھ الفاظ کا استعمال بھی محلِ نظر ہے۔ مثلاً ''شکرقندی'' نہیں بلکہ شکرقند ہوتا ہے، جسے عوام کی زبان میں ''کون'' کہا جاتا ہے۔ افسانہ مختصر لیکن سبق آموز ہے جس میں گھوڑے کی بے بسی اور انسانوں کی بے حسی کو پیش کیا گیا ہے، جو جانوروں کے تئیں ہماری ہوتی ہے۔ ارشد منیم نے ''سکھ'' افسانے کا کلائمکس نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے اور افسانے کا لب لباب یہ ہے کہ سکھ کی اصل وجہ جنسی خواہش کی تسکین ہوتی ہے۔ ''دھوکے باز'' افسانہ میں دوست کی بیوی پر دوست کی بری نظر کو دکھایا گیا ہے۔ صبا کا قاسم کے ساتھ کلکتہ چلے جانا اور اپنے شوہر کو چھوڑ دینا آج کے دور کے المیے کی عکاسی ہے۔ نظمیں، غزلیں اور کتابوں پر تبصرے بھی معلوماتی ہیں۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی خوب ہے۔ محمد میکائیل قاسمی نے ''پیارے نبی کا بچپن'' پر اچھا مضمون لکھا ہے جو مختصر ترین ضرور ہے، لیکن کافی سبق آموز ہے۔ سائنسداں پروفیسر عبدالسلام پر بھی اچھی تحریر شامل اشاعت ہے۔ دوسرے اندرونی سرورق پر نادمؔ بلخی کی رباعیات شامل ہیں اور ساتھ ہی ان کا مختصر، مگر مفید تعارف بھی خاصے کی چیز ہے۔ الغرض ''زبان وادب'' کا یہ شمارہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک اہم دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ پروف ریڈینگ کی یہاں تعریف نہ کی جائے تو ادبی بخالت ہوگی۔ زیادہ والسلام!

(ڈاکٹر) صابر علی سیوانی، حیدرآباد

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	حمد	افسر جمال افسؔر	۷۴
☆	دودھ کا دودھ پانی کا پانی	ڈاکٹر بانو سرتاج	۷۵
☆	تین سوال	سلطان احمد ساحؔل	۷۷
☆	پلاسٹک سرجری	امتیاز احمد انصاری	۷۸
☆	انجن	اظہر نیر	۷۹
☆	ایک حقیقت، ایک کہانی	علقمہ شبلی	۸۰

افسر جمال افسؔر

Karimganj, Gaya (Mob. 9631577374)

حمد

تری ذات اوّل ، تری ذات آخر ہر اک جا ، ہر اک پل تو حاضر تو ناظر
ہر اک شئے کا باطن ، ہر اک شئے کا ظاہر ہر اک شئے کا خالق ، ہر اک شئے پہ قادر
تو مالک جہاں کا ، ہمارا خدا ہے
مصیبت میں تیرا ہی اک آسرا ہے

زمیں آسماں ، کہکشاں ، چاند ، تارے یہ کوہ و دمن ، یہ حسیں سب نظارے
یہ بادل ، یہ بارش ، یہ طوفاں ، شرارے سمندر ، ندی ، موج ، خشکی ، کنارے
یہ تیری ہی قدرت کی جلوہ گری ہے
کسی کی نہ اس میں تری ہم سری ہے

زمیں سے اناجوں کو تو ہی اُگائے پھلوں کے درختوں کے جھرمٹ لگائے
ہوا سانس لینے کو تو ہی چلائے تو ہی صاف پانی کے چشمے بہائے
غرض یہ کہ ہر چیز تیری عطا ہے
ازل سے ابد تک یہی سلسلہ ہے

زمیں آسماں میں تری بادشاہی ہر اک شئے یہی دے رہی ہے گواہی
تجھی کو ہے بس زیب عالم پناہی نہ سمجھیں اگر ہم تو ہے کم نگاہی
سحر کو شب تیرگی سے نکالے
ہر اک ڈوبتے کو بھی تو ہی سنبھالے

❀❀❀

ڈاکٹر بانو سرتاج

Sartaj House, Jindran Nagar, Near Ist Mseb Tower, Pandharkawada Road ,
Yavatmal (M.S.) 445001 (Mob.9423418497)

دودھ کا دودھ پانی کا پانی

پرانے زمانے کے راجے مہاراجوں کے مزاج بھی عجیب ہوتے تھے۔ ناراض ہوتے تو شہر بدر کر دیتے، قید خانے میں ڈال دیتے، پھانسی چڑھا دیتے اور خوش ہوتے تو جھولی بھر بھر انعام دیتے۔

شکر کی بات تھی کہ گوپال بھانڈ کے ساتھ جو ہوا، اچھا ہوا۔

ہوا یہ کہ ایک دن راجہ کرشن چندر، گوپال بھانڈ سے اتنے خوش ہوئے کہ بولے:

''مانگ لو جو جی میں آئے...... مانگ لو۔''

''کچھ بھی مانگ لوں مہاراج؟''

''ہاں کچھ بھی......'' راجہ نے فراخ دلی سے کہا۔

دربار میں موجود گوپال کے مخالفین کی سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ وہ ڈر گئے کہ نہ جانے گوپال کیا مانگ لے...... پردھان منتری پد (عہدہ) سیناپتی کا عہدہ اور ہم پر حکم چلانے لگے۔

ادھر گوپال بھانڈ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مانگے تو کیا مانگے۔ راجہ مسلسل اصرار کئے جا رہے تھے۔ آخر اس نے ہمت کر کے کہا:

''مہاراج، جہاں اتنا کرم کیا ہے، وہاں ایک درخواست اور قبول کریں، میں کل انعام مانگوں تو چلے گا۔''

''ضرور چلے گا بلکہ دوڑے گا۔''

راجہ نے بخوشی اجازت دے دی۔

مخالفین کی جان میں جان آئی، مل کر بیٹھے اور طے کیا کہ گوپال کے دوست بن کر دشمنی نبھائی جائے یعنی اسے اتنا کنفیوز کر دیا جائے کہ وہ کچھ صحیح نہ مانگ سکے۔ مقصد طے ہوا تو سوال یہ کھڑا ہوا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔؟

لاٹری نکلی شہر کوتوال کے نام!

شام کو شہر کوتوال جان بوجھ کر گوپال بھانڈ کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ گوپال بھانڈ نے اسے پکار لیا۔ رسمی بات چیت کے بعد شہر کوتوال نے پوچھا:

''کیا بات ہے۔ پریشان نظر آ رہے ہو۔''

''کوئی خاص بات نہیں۔''

''خاص بات کیسے نہیں؟ تمہارا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ مجھے اپنا ہمدرد سمجھو چاہے کچھ اور نہ کر سکوں، مشورہ تو دے ہی سکتا ہوں۔''

گوپال بھانڈ نے فوراً کہا:

''مہاراج نے خوش ہو کر کوئی بھی چیز مانگنے کو کہا ہے۔''

شہر کوتوال نے گوپال کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا:

''یہ تو خوش ہونے والی بات ہے، ہاں تو کیا مانگ رہے ہو تم؟''

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا مانگوں؟......''

''میں مدد کروں؟'' شہر کوتوال نے اپنائیت سے کہا۔

''ہاں ضرور...... بڑی مہربانی ہوگی۔''

پہلے تو کوتوال نے اِدھر اُدھر کی چیزیں بتلائیں پھر کہا:

''ایسا کرو...... مہاراج کا سفید ہاتھی مانگ لو...... سب پر دھاک بیٹھ جائے گی۔''

''سفید ہاتھی!'' گوپال چکرا گیا۔

''ہاں سفید ہاتھی۔ راجہ کا ہاتھی ہونے کے سبب اس کے رہنے کھانے سب کی ذمہ داری مہاراج کی ہی ہوگی۔ تم شان سے ہاتھی پر بیٹھ کر دربار جانا، شان سے لوٹنا، سیر کو نکلنا۔''

گوپال بھانڈ کو مشورہ پسند آیا۔ کوتوال دل ہی دل میں خوش

ہو رہا تھا کہ واہ رے احمق! بڑا عقل مند بنا پھرتا ہے۔ گھر میں کھانے کے لالے پڑے رہتے ہیں اور خواب دیکھتا ہے ہاتھی کے۔

گوپال بھانڈ نے کوتوال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''کمال کر دیا، چٹکی میں میرا مسئلہ حل کر دیا۔ آپ کو تو راج دربار میں اونچا عہدہ ملنا چاہیے۔'' اپنی تعریف سن کر کوتوال خوشی سے پھول گیا۔ بے ساختہ بول اٹھا:

''راج دربار میں نہیں ہوں تو کیا؟ لوگوں کو مشورہ لینا ہوتا ہے تو میرے پاس ہی دوڑے آتے ہیں۔''

اور بس گوپال بھانڈ سمجھ گیا کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ نہ صرف مخالفین کے جال میں نہیں پھنسے گا بلکہ ان کو کراری چوٹ دے گا، سبق سکھائے گا۔

دوسرے دن گوپال بھانڈ نے راجہ سے ان کا سفید ہاتھی مانگ لیا۔ راجہ حیرت سے گوپال کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ اسے انعام دینا تو چاہتے تھے، مگر اتنا بڑا انعام ہرگز نہیں دینا چاہتے تھے، مگر مجبور تھے، وعدہ کر چکے تھے۔ سفید ہاتھی انعام میں دے دیا۔ مہاوت بھی خدمت اور دیکھ بھال کے لئے دے دیا۔

گوپال بھانڈ ہاتھی لے کر گھر پہنچا۔ بچے بڑے، آس پڑوس کے تمام لوگ ہاتھی دیکھنے پہنچ گئے۔ تب تک گوپال نے دو مزدوروں کو بلا کر مکان کے بازو خالی پڑی زمین پر مہاوت کے لئے جھونپڑی بنوا دی ہاتھی باندھنے کے لئے لوہے کا ستون کھڑا کر دیا۔

خالی پڑی زمین ایک لوہار کی تھی اسے خبر ملی تو سرپٹ دوڑا راجہ کے پاس آیا اور فریاد کی۔ راجہ نے گوپال کو بلا کر جواب طلب کیا۔ گوپال نے صفائی دی:

''مہاراج! میرا مکان چھوٹا ہے۔ دروازہ بھی چھوٹا ہے۔ ہاتھی گھر میں رہ سکتا ہے، نہ دروازے میں سے گزر سکتا ہے، اس لئے کھلے مقام پر باندھ دیا۔''

''چلو ہاتھی باندھا تو باندھا، مہاوت کے لئے جھونپڑی کیوں بنائی؟ مہاوت تو چھوٹے دروازے سے گھر میں گھس سکتا تھا۔''

''چلئے مان لی آپ کی بات، مان لی۔ گھر میں گھس جاتا، مگر رہتا کہاں؟'' گوپال نے معصوم چہرہ بنا کر پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' راجہ نے پوچھا

''چڑی مار پرندہ فروخت کرتا ہے تو پنجرہ ساتھ دیتا ہے۔''

راجہ ہنس پڑے۔ پردھان منتری کو حکم دیا:

''گوپال کو ایک وسیع حویلی دے دی جائے جس میں وہ اس کا خاندان، ہاتھی، مہاوت سب ساتھ رہ سکیں۔''

حکم کی تعمیل ہوئی۔ وار الٹا پڑ گیا تھا۔ گوپال کو ہاتھی کے ساتھ حویلی بھی مل گئی۔

اب کیا کیا جائے؟ مخالفین کی چوکڑی پھر مل کر بیٹھی۔ طے ہوا کہ ہاتھی کا دانہ پانی بند کروا دیا جائے۔ دلیل یہ دی جائے کہ ہاتھی تو راجہ انعام میں دے چکے۔ اب کھانا بھی وہی کھلائے۔''

گوپال ہاتھی کا پیٹ کہاں سے بھرتا؟ اس نے مہاوت سے مشورہ کیا۔ مہاوت نے کہا:

''بات تو باورچی خانے کے منتظم نے ٹھیک کہی ہے۔ محل سے انتظام کیوں ہوگا؟ ہاتھی کا پیٹ بھرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔''

گوپال نے مہاوت کو پٹایا: ''تم راجہ سے ذکر کرو۔''

''راجہ سے ذکر کروں؟ میری کیا حیثیت؟'' مہاوت نے صاف کہہ دیا، پھر اپنی اوقات کے مطابق مشورہ دیا:

'' آپ خواہ مخواہ کی فکر کرتے ہیں، آس پاس کھیت ہیں، ہاتھی کو راستہ دکھا دیں۔ وہ اپنا پیٹ خود بھر لے گا۔''

ہاتھی نے کھیتوں میں وہ اودھم مچایا، وہ اودھم مچایا کہ کھیت کے مالکوں نے راج دربار میں اودھم مچا دیا......نقصان کی بھرپائی کی دہائی دینے لگے۔ گوپال بھانڈ کو پھر طلب کیا گیا۔ راجہ نے پوچھا:

''اب کیا تماشہ کھڑا کر دیا تم نے؟''

''میں نے نہیں مہاراج! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا سفید ہاتھی نے کیا۔ میں نے مہاوت سے سفید ہاتھی کی شرارت کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا، مہاراج پوچھیں گے تو بتاؤں گا۔''

راجہ نے یہ سن کر مہاوت کی طرف رخ کیا تو اس نے گھبرا کر ساری پول کھول دی، بولا:

سلطان احمد ساحلؔ

Flat No. D-2, Jawahar Complex,2nd Floor, Near Zam Zam Mart, Main Road Nohsa
Phulwarisharif, Patna - 801505 (Mob. 9135707097)

تین سوال

زمانہ قدیم میں ہارون رشید بہت ہی مشہور خلیفہ تھے۔ وہ اپنے وزیروں کو بہت مانتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کا ایک وزیر سخت بیمار ہوا۔ خلیفہ بذاتِ خود وزیر کی مزاج پرسی کے لئے گئے۔ اُس وزیر کا ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا، بہت ہی وفادار، نیک اور عقلمند!

وزیر کا چھوٹا لڑکا خلیفہ کے لاؤلشکر کو دیکھتے ہی بڑے ادب سے جھک کر سلام پیش کرتے ہوئے قریب ہی جا کر بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے اُس لڑکے کی ذہانت اور عقلمندی کا امتحان لینے کے لئے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

''بیٹا! میری انگوٹھی میں جو ہیرا ہے، اس سے بھی کوئی خوبصورت اور قیمتی چیز دنیا میں موجود ہے؟''

لڑکے نے فوراً جواب دیا: ''جی ہاں حضور، اس جڑے ہوئے ہیرے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور قیمتی خود وہ شخص ہے جس نے اپنی انگلی میں یہ انگوٹھی پہن رکھی ہے۔''

یہ جواب سن کر خلیفہ نے دوسرا سوال پوچھا:

بولو! تمہیں اپنا مکان اچھا لگتا ہے یا میرا محل؟

لڑکے نے کچھ سوچ کر برجستہ جواب دیا:

''اس وقت مجھے اپنا ہی گھر اچھا لگ رہا ہے، کیونکہ اس وقت آپ میرے غریب خانہ میں رونق افروز ہیں۔''

خلیفہ لڑکے کے جواب سے بے حد متاثر ہوئے اور جاتے جاتے خوش ہو کر اپنا تیسرا اور آخری سوال اب بھی پوچھ لیا:

اچھا تم یہ بتاؤ، کیا تم خلیفہ بننا پسند کرو گے؟

لڑکے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''نہیں حضور! میں خلیفہ بننا نہیں چاہتا، کیونکہ اس کے حقدار خلیفہ کے ہی صاحبزادے ہوں گے۔''

لڑکے کا یہ جواب سن کر خلیفہ بے حد خوش ہوا اور لڑکے کی حاضر جوابی کی تعریف کرتے ہوئے اسے ڈھیر سارے انعام واکرام سے نوازتے ہوئے وزیر کے گھر سے رخصت ہوا۔ ❁❁

باورچی خانے کے انچارج نے کہا:

''شاہی باورچی خانے سے ہاتھی کا کھانا نہیں ملے گا۔''

یہ سن کر راجہ نے باورچی خانہ کے انچارج سے پوچھا، اس نے کہا شہر کوتوال نے کہا تھا۔

''کیا کہا تھا......؟''

''کہا تھا کہ سفید ہاتھی مہاراج نے گوپال بھانڈ کو دے دیا ہے۔ اب اسے کھلانے پلانے کی ذمہ داری گوپال بھانڈ کی ہے۔''

شہر کوتوال سے جواب طلب کیا گیا:

''تمہیں بیچ میں کودنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بہت سے درباری گوپال بھانڈ کو ہاتھی انعام دینے کے خلاف تھے۔ اسے تنگ کرنے کے لئے انہوں نے مجھ سے مدد مانگی تھی۔''

راجہ سارا معاملہ سمجھ گئے بولے: ''تم سب سازشی ہو۔ تم سے اچھا تو گوپال بھانڈ سیدھا سچا، اسی لئے ہم اسے عزیز رکھتے ہیں۔ تم لوگوں کی سازش سے واقف ہوجانے کے بعد بھی اس نے ہم سے شکایت نہیں کی۔ ہوشیاری سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔

سفید ہاتھی گوپال کو ہم نے انعام میں دیا ہے۔ وہ اسی کا رہے گا۔ اس کا تمام خرچ شاہی خزانے سے کیا جائے گا اور جنہوں نے اس سازش میں حصہ لیا ہے۔ ان پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔'' ❁❁

امتیاز احمد انصاری
H.No.24, Railpar, Jahangiri Mohalla,
Asansol - 713302 (W.B.) (Mob.9749289061)

پلاسٹک سرجری

انسانی جسم ایک بہت ہی پیچیدہ مشین کی طرح ہے، جس طرح کسی مشین کے پرزوں میں گڑبڑی پیدا ہوجانے پر پوری مشین متاثر ہوجاتی ہےاور کبھی کبھی تو کام کرنا ہی بند کر دیتی ہے۔اسی طرح یہ انسانی جسم بھی ہے جو کسی کمزوری، بیماری، بے احتیاطی یا حادثہ کا شکار ہوکر اپنا کام بند کر دیتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مشین کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے مستری کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنے تجربات اور معلومات کی بنیاد پر مشین کی گڑبڑی کے نظام ٹھیک یا درست کرتے ہیں۔خرابی دور کرنے کے عمل کے دوران مستری ضرورت کے مطابق بعض اوقات مشین کے خراب پرزے بھی تبدیل کر دیتے ہیں، ایسا ہی کچھ انسانی جسم اور ان کی خرابی دور کرنے والوں کا معاملہ بھی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ مشین کی مانند انسانی جسم کے نظام میں بھی گڑ بڑی پیدا ہونے پر انسان بیمار پڑ جاتا ہے، پھر یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ بیماریوں کا علاج پرانے زمانے میں جڑی بوٹیوں سے کیا جاتا تھا۔ایسے معالج حکیم یا وید کہلاتے تھے، پھر بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ طریقہ علاج میں بھی تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔جڑی بوٹیوں سے آگے بڑھ کر ٹیبلیٹ ،کیپسول،سیرپ اور انجکشن سے علاج عام ہونے لگا۔دواؤں کے ذریعہ بیماریوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کوفزیشین کا نام دیا گیا۔

سائنس کے دیگر شعبے کی ترقی کے ساتھ میڈیکل سائنس کے شعبہ نے بھی ترقی کی اونچائیوں کو چھونا شروع کر دیا۔اب تو چوٹ لگنے، کسی حادثے میں زخمی ہونے یا کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہونے پر جب جسم کا کوئی عضو متاثر یا خراب ہوجاتا ہے تو چیر پھاڑ کر کے اس متاثرہ عضو کی پیوند کاری کر دی جاتی ہے یا پھر اسے جسم سے باہر نکال دیا جاتا ہے بلکہ ضرورت ہوتو اعضا تک تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔چیر پھاڑ کے ذریعہ علاج کئے جانے کو آپریشن یا سرجری کہا جاتا ہےاور سرجری کرنے والے ڈاکٹر سرجن کہلاتے ہیں۔

جدید دور میں صرف بیماریوں کے علاج کے لئے سرجری کا سہارا نہیں لیا جارہا ہے، بلکہ اپنے آپ کو خوبصورت اور پرکشش نظر آنے کے لئے بھی سرجری کی مدد لی جارہی ہے۔

انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ دیکھنے میں اچھا لگے، اس کا چہرہ خوبصورت اور اعضا درست نظر آئیں اور جسم پر بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات ظاہر نہ ہوں، چنانچہ اس زمانے میں انسان ان خواہشات کی تکمیل کے لئے پلاسٹک سرجری جیسے جدید اور ترقی یافتہ علاج کا سہارا لے رہا ہے۔اس طریق علاج کے ذریعہ انسانی جسم کے عضو کی بناوٹ یا جسم کے ظاہری نقص کو دور کیا جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پلاسٹک سرجری دراصل اعضا کی تعمیر نو، ان کی بحالی اور تبدیلی کا عمل ہے۔جب کسی حادثے، بیماری یا پیدائشی نقائص کی وجہ کر جسمانی عمل میں کمی آنے لگتی ہے یا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہےتو ایسی حالت میں بھی پلاسٹک سرجری کی مدد لی جاتی ہے۔

پلاسٹک دراصل یونانی لفظ ''پلاسٹکوس'' سے لیا گیا ہے،جس کے معنی شکل بنانے یا موڑنے کے ہیں۔پلاسٹک سرجری کا بانی قدیم ہندوستان کا بہت مشہور فزیشین اور سرجن ''سشرٹ'' (Sushruta) کو مانا جاتا ہے۔تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۰۰۰ق م میں جب کسی جرم کی سزا کے طور پر کسی مجرم کی ناک کاٹ دی جاتی تھی تو موم کی ناک بنا کر پیشانی اور گال کے چمڑوں کی مدد سے اسے کٹے ہوئے ناک کے مقام پر چپکا دیا جاتا تھا۔یہ الگ بات ہے کہ اس وقت اس کا نام پلاسٹک سرجری نہیں تھا۔ پلاسٹک سرجری کی دو خاص قسمیں ہیں یعنی تعمیر نو کی سرجری (Reconstructive) اور Cosmetic سرجری۔

آج کی دنیا میں خود کو پرکشش بنانے کے لئے پلاسٹک سرجری کا رجحان بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔فلمی دنیا سے جڑی ہوئی شخصیتیں مختلف ملکوں میں اپنی ناک، بھنوں، ٹھوڑی، ہونٹ، کان اور پستان وغیرہ کی شکل و بناوٹ اس طریق علاج سے تبدیل کرا رہے

اظہر نیر
Vill&P.o. Barhulia, Via. Kansi Simri, Dist. Darbhanga - 847106 (Mob. 9939749452)

انجن

قیوم صاحب گاؤں کے مڈل اسکول میں ٹیچر تھے،ان کی شادی کے تین سال بعد ایک بیٹا پیدا ہوا تو اس کے دادا، دادی نے اس کا نام ارمان رکھا۔ارمان جب بڑا ہوا تو دادا سے قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ارمان پڑھنے میں تیز تھا۔سال کے اندر ہی قرآن شریف ختم کرلیا۔ساتھ ہی دادا سے انگریزی وغیرہ پڑھنا شروع کیا۔سب لوگ اس سے پیار کرتے تھے، پھر ارمان کے دوسرے بھائی کی پیدائش ہوئی۔

اس کا نام آرزو رکھا گیا،اب ارمان کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی گئی، پھر ارمان کی بہن ہوئی تو سبھی لوگوں کو بے حد خوشی ہوئی۔اس طرح ارمان کے حصہ میں پیار کی کمی آنے لگی۔ارمان کو بھائی بہن سے حسد ہونے لگا، پھر ایک بھائی اور پیدا ہوا۔ارمان دو بھائی اور بہن کا بھائی بن گیا۔ہر چیز میں ارمان کے حصہ میں کمی ہوتی گئی۔پڑھنے سے طبیعت اچاٹ ہوگئی۔اسکول سے بھی شکایت آنے لگی۔امتحان قریب تھا، مگر پڑھنے میں طبیعت نہیں لگتی۔ہر وقت کرکٹ کھیلنے میں مشغول رہتا۔ایک روز اس نے اپنے دادا سے کہا:''مجھے کرکٹ کا بلا اور گیند چاہئے۔میں کب تک دوسروں کے بلا سے کھیلوں گا۔''

''ٹھیک ہے تم چھ ماہی امتحان میں اچھے نمبر لاؤ، میں تم کو بلا اور گیند ضرور خرید دوں گا۔تم اس کے انجن ہو۔انجن سمجھتے ہو۔ریل گاڑی میں ڈبہ لے جانے والے کو انجن کہتے ہیں۔انجن دس پندرہ ڈبے کو ایک ساتھ تنہا کھینچتا ہے،تم تو صرف چار ڈبے کے انجن ہو یعنی گھر میں سب سے بڑے تم ہو،تمہارے پیچھے صرف تین بھائی بہن ہیں،تم اچھا کروگے تو سب بھائی بہن اچھا کریں گے۔میٹرک کا چھ ماہی امتحان قریب ہے تم اچھے نمبر لے آؤ تو سب کچھ خرید دوں گا۔''

دادا کے کہنے پر ارمان پڑھنے میں توجہ دینے لگا اور پھر چھ ماہی امتحان میں پورے اسکول میں اول آیا۔سبھی لوگ خوش ہوئے دوسرے روز دادا نے کرکٹ کا سامان خرید کر ارمان کے حوالے کیا اور کہا کہ اب میٹرک میں بھی اول آؤ گے تو سائیکل خرید دوں گا۔

ارمان وقت پر پڑھنے لگا۔میٹرک کا امتحان دینے وہ شہر گیا۔امتحان دے کر آیا تو دادا نے پوچھا:''کیسا امتحان ہوا؟''

''انشاءاللہ میں ضرور اول آؤں گا۔آپ کو سائیکل دلانا ہوگا۔''

دوسرے بھائی بہن بھی محنت سے پڑھنے لگے۔سبھی نے کہا کہ میں بڑے بھائی کی طرح اسکول میں اول آؤں گا تو دادا مجھے بھی کرکٹ اور سائیکل خرید دیں گے۔جب میٹرک کا نتیجہ نکلا تو ارمان پورے اسکول اور ضلع میں اول آیا۔دادا نے دوسرے ہی روز سائیکل خرید کر ارمان کے حوالہ کیا۔اس طرح آرزو، سفیان اور فاطمہ نے بھی اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔دیکھو بچو! اگر انجن ٹھیک کام کرے تو گاڑی اپنی منزل پر پہنچ جائے گی۔انجن کا ٹھیک ہونا شرط ہے۔ ❀❀

ہیں۔اس سلسلے میں ہندی فلموں کی مشہور اداکارہ شلپا سیٹی اور راکھی ساونت کا نام لیا جاسکتا ہے۔کسی حادثے کے شکار لوگ بھی صورت اور ہیئت بگڑنے پر اسے درست کرانے کے لئے اسی سرجری کا سہارا لیتے ہیں۔پیدائشی طور پر کچھ بچوں کے ہونٹ میں درار ہوتا ہے یا ان کے تالو کٹے ہوتے ہیں جس سے وہ بدنما دکھائی دیتے ہیں اور کھانے پینے میں بھی انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے،ایسے بچوں کی پلاسٹک سرجری کرکے اس نقص کو دور کردیا جاتا ہے۔یوں تو ملک کے کئی اسپتالوں میں پلاسٹک سرجری کے اچھے انتظامات ہیں،مگر حیدرآباد کے یشودھا ہاسپٹل کا شمار ملک کے بہترین پلاسٹک سرجری کرنے والے اسپتالوں میں ہوتا ہے۔بہت سارے سماجی وفلاحی تنظیمیں اور غیر سرکاری ادارے بچوں کے کٹے ہونٹ اور کٹے تالو کی مرمت کے لئے مفت پلاسٹک سرجری کا انتظام کیا کرتے ہیں۔ ❀❀

علقمہ شبلی

ایک حقیقت، ایک کہانی

آؤ روبی ، آؤ پپو — آؤ جوہی ، آؤ گڈو
آؤ سنائیں اپنی زبانی — ایک حقیقت ، ایک کہانی
ایک تھا بالک پیارا پیارا — سب لوگوں کی آنکھ کا تارا
روشن آنکھیں ، روشن چہرا — تن بھی اُجلا ، من بھی اُجلا
رہتا تھا آنند بھون میں — پھول ہو جیسے کوئی چمن میں
بات میں اُس کی امرت رس تھا — دل میں تھا بس درد وطن کا
جب اُس نے کچھ ہوش سنبھالا — گھر گھر پھیلا اُس کا اُجالا
سوئے ہوؤں کو اُس نے جگایا — روٹھے ہوؤں کو اُس نے منایا
بات پتے کی اُس نے بتائی — آزادی کی راہ دکھائی
اُس کو بڑوں نے لیڈر مانا — بچوں کے وہ ہوگئے چاچا
اُس نے لہو سے گلشن سینچا — ہر ہر پگ پر پھول کھلایا
پھولوں کا وہ شہزادہ تھا — اپنے چمن کا دلدادہ تھا
بوڑھوں میں تھا وہ اک بوڑھا — بچوں میں تھا گویا بچا
سچ پوچھو تو وہ تھا جواہر — سب کا ساتھی سب کا رہبر
ہم میں نہیں ہے اب وہ مالی — یاد مگر ہے دل میں اُس کی
کھیتوں کی ہریالی ہے وہ — ہر اک پھول کی لالی ہے وہ
چڑیوں کی چہکار وہی ہے — ہونٹوں کی للکار وہی ہے
نقش قدم ہے ہر جا اُس کا — نام ہے اب بھی زندہ اُس کا
ایک حقیقت ، ایک کہانی — سن لی تم نے میری زبانی
اب تم اُس کا نام بتاؤ — بچو! کچھ انعام بھی پاؤ

❁❁❁

(ماخوذاز "تارے زمین کے" مطبوعہ کلکتہ ۱۹۷۶ء)

غزل

اقرارِ وصل کرنے پہ انکار ہوگیا
یہ تو جناب آپ سے سو بار ہوگیا

دے کر زبان وصل کی پھرنا ہے کب درست
اقرار ہوگیا تو بس اقرار ہوگیا

الفت میں اور ہوگیا ایذا پسند دل
مرنا اس سے اور بھی دشوار ہوگیا

خنجر کے وار ہم تو سنبھالا کئے مگر
بچنا تمہارے تیر سے دشوار ہوگیا

ساقی یہ ہے اعجاز تری چشم مست کا
میخوار جو نہ تھا وہ اب میخوار ہوگیا

کیا میکشوں نے دیکھ لی مستی بھری نگاہ
بدمست کوئی ہوگیا ، سرشار ہوگیا

مولانا ارمآن

مولانا ارمآن کا پورا نام سید محمد عبدالحکیم، لقب ابونعیم اور تخلص ارمآن تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں چھپرہ کے ایک اعلیٰ سادات خاندان میں ہوئی اور ۲۷ نومبر ۱۹۵۲ء کو بتیا میں انہوں نے وفات پایا۔ مولانا کے والد کا نام سید محمد کریم بخش تھا۔ اپنے بڑے بھائی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، مدرسہ اسلامیہ موتیہاری میں فوقانیہ تک تعلیم پائی اور پھر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کی سند لی اور مسجد درگاہ شاہ ارزاں میں کچھ دنوں امامت کے منصب پر فائز رہنے کے بعد کے۔ آر۔ مشن اسکول، بتیا میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی اور یہیں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مولانا ارمآن مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک اور بی اے (انگریزی) کے بھی سند یافتہ تھے اور انگریزی میں نہایت عمدہ صلاحیت رکھتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا ارمآن نے نقشبندی سلسلہ کے بزرگ مولانا سید محمد شفیق سندیلوی کے ہاتھ پر بیعت کیا اور روحانی سلسلہ کی تعلیم حضرت محمد امین سے حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء کا زمانہ مولانا ارمآن پر جذبی کیفیت کے وفور کا زمانہ ہے۔ مولانا ارمآن نے اپنی بیاض شاعری کو اپنے دل کا آئینہ کہا ہے۔ پٹنہ میں ان کی تعلیم کا زمانہ، یہاں مشاعروں کی بہار کا تاریخ ساز زمانہ تھا اور اس زمانے کے پٹنہ کالج کے مشاعرے میں نوجوان شاعر ارمآن کی شرکت بھی ہوا کرتی تھی۔ مولانا ارمآن، حضرت نوحؔ ناروی کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کے رنگ میں طویل غزلیں کہتے تھے۔ ''یوم آزادی''، ''آمد فصل بہار'' اور ''بزم دوشیزگان'' وغیرہ ان کے صحیح جذبات وخیالات کی ترجمان اور نہایت حسین و دلنواز نظمیں ہیں اور مجموعی طور پر ان کی شاعری میں ان کی شخصیت پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے۔ (تصویر اور سوانحی کوائف وکلام شاعر، ماخوذ، بشکریہ ماہنامہ ''اشارہ'' پٹنہ، مئی ۱۹۶۲ء)

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 | November - 2024 | No. 11

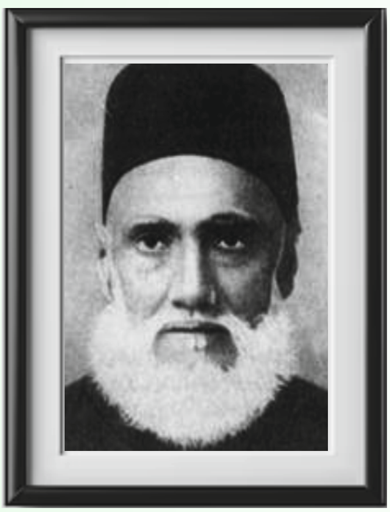

اسماعیل میرٹھی

ذکاءاللہ دہلوی

ماسٹر رام چندر

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15